چین
یلیا سپینسر
علی ناصر زیدی
قیمت چار روپے

چین

سرزمین اور باشندے

تصنیف : کورنیلیا سپینسر

ترجمہ : علی ناصر زیدی

ناشر

شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز

لاہور - پشاور - حیدرآباد - کراچی

فہرست مضامین

مصنّفہ کے مختصر حالاتِ زندگی

گریس ایس۔ یُو کی جن کا تصنیفی نام کورنیلیا سپینسر ہے، ۱۸۹۹ء میں وسطی چین میں پیدا ہوئیں۔ اُن کا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ وہیں گزرا۔ وہیں اُن کی شادی ہوئی اور دو بیٹے پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں اُن کا گھرانا ریاست ہائے متحدہ امریکا واپس آ گیا۔ وہ چین کے مختلف صوبوں میں رہی ہیں۔

۱۹۳۳ء میں مس سپینسر نے چینیوں کے متعلق چھوٹے چھوٹے مضامین لکھنے شروع کیے۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکا پہنچنے کے تھوڑے دن بعد انھوں نے کومپٹن پکچرڈ انسائیکلوپیڈیا کے لیے چین پر ایک مضمون تیار کیا۔ مس سپنسر نے بچّوں کے لیے بہت سی معلوماتی کتابیں بھی لکھیں۔ ان کے موضوعات ہیں چین، جاپان، جزائر فلپائن، ہندوستان، وزیر اعظم نہرو، سفیر کارلوس رومولو، صدر ہیری ٹرومین اور پرل بک وغیرہ شامل ہیں۔

انھوں نے دو ناول بھی لکھے ہیں۔

مترجم کے مختصر حالاتِ زندگی

علی ناصر زیدی ۱۹۲۲ء میں کرت پور، ضلع بجنور (یو۔ پی) کے ایک سیّد گھرانے میں پیدا ہُوئے۔ تعلیم بجنور، دہرہ دون اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حاصل کی، جہاں سے طبیعات میں ایم۔ ایس سی کرنے کے بعد انھوں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ لکھنے پڑھنے سے شروع ہی سے شغف تھا۔ گزشتہ سولہ سال سے تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔ سائنسی مضامین کو سادہ و دلچسپ اُردو میں پیش کرنا اُن کی خصوصیّت ہے۔ چنانچہ اب تک عام سائنسی اور معلومات افزا موضوعات پر انھوں نے تقریباً ستّر کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے کچھ تصانیف ہیں اور کچھ تراجم۔ اُن کی دو کتابیں ثانوی تعلیمی بورڈوں کے نصاب میں بھی شامل ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اُردو انگریزی میں انھوں نے سات سَو کے قریب مضامین بھی تحریر کیے ہیں، جو پاکستان کے ممتاز رسائل و جرائد میں شائع ہونے کے علاوہ لندن کے بعض رسائل میں بھی چھپے ہیں۔

تعارف

دُنیا کے ہر چار انسانوں میں ایک چینی ہے۔ اِس عظیم ملک کے باشندے قدیم زمانے سے کاہلی کے لیے بدنام رہے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ اس کی ماضی کی داستان طویل اور دلچسپ ہے۔ اب یہ مُلک ایک نئے جذبے کے تحت بیدار ہو رہا ہے اور اس کے عوام اپنی بقا اور ترقی کے لیے بڑی محنت کر رہے ہیں۔

زیرِنظر کتاب ایک ایسی امریکی خاتون کی تصنیف ہے جن کا بچپن اور جوانی چین میں گزرے۔ وہ مشرق کے اس مُلک کو بھی اُتنی ہی اچھی طرح جانتی ہیں جس طرح مغرب سے واقف ہیں۔ انھوں نے تمام سیاسی تفرقات سے بالا ہو کر اس کتاب میں چینیوں کی گزشتہ تاریخ، اُس کا جغرافیہ، جاپان اور دوسرے مُلکوں کے ساتھ لڑائیاں، مغرب کا اثر، روس کے ساتھ تعلقات، رہن سہن، گھریلو زندگی، زراعت، شہر اور دیہات، محلّے اور بازار، کھانا پکانا، تفریح، تعلیم، آرٹ ــــــ غرض اہلِ چین کی زندگی کے ہر پہلو پر وافر روشنی ڈالی ہے اور اُن حالات کا تجزیہ کیا ہے جن کے تحت یہ ملک کمیونسٹ بنا۔ مصنّفہ نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور قوم پرست نیز کمیونسٹ حکمرانوں کے محاسن و معائب کو بے کم وکاست بیان کر دیا ہے۔

اِس کتاب میں ہمیں چین اور اُس کے باشندوں کے تازہ ترین حالات بڑے اچھے انداز میں ملتے ہیں۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے جابجا عمدہ تصاویر شامل کی گئی ہیں۔ یہ اپنی قسم کی نئی کوشش ہے۔ مَیں نے اس کے ترجمے میں اس کی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی پُوری کوشش کی ہے۔

علی ناصر زیدی

پہلا باب

چین پر طائرانہ نظر

ہم سب لفظ "چین" سے واقف ہیں اور اسے اکثر روزمرّہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ ہماری پلیٹیں اور دوسرے برتن چینی کے ہوتے ہیں۔ ہم انھیں چینی کے برتن اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پہلے چین میں تیار ہوئے تھے۔ چین کا ریشم، پنکھے اور چائے بھی مشہور ہے۔ کاغذ جو اب اس قدر عام ہو چکا ہے، سب سے پہلے چین ہی میں تیار کیا گیا تھا۔

اس کے باوجود اہلِ چین اپنے ملک کو 'چین' نہیں کہتے بلکہ اُسے وسطی سلطنت[1] کہہ کر پکارتے ہیں حالانکہ اب وہاں کسی کی بادشاہت نہیں رہی۔ اسی لیے اُس کے نام کے ساتھ لفظ 'جمہوریہ'[2] شامل کر دیا گیا ہے۔ اہلِ یورپ حضرت مسیح ؑ سے تقریباً تین سَو سال پہلے اِس مُلک سے واقف ہوئے اور انھوں نے اس کا نام چین رکھا۔ اُس زمانے میں یہاں ایک شاہی خاندان کی حکومت تھی، جس کا نام 'چِن'[3]، تھا۔ اسی رعایت سے یہاں کے لوگ چینی اور یہ مُلک چین کہلانے لگا۔

اہلِ چین اپنے ملک کو وسطی سلطنت کہنے میں قطعی حق بجانب ہیں۔ اگر ہم اُس زمانے کا تصوّر کریں، جب دخانی اور ہوائی جہاز استعمال نہیں ہوتے تھے یا اُن نئے نقشوں پر نظر ڈالیں جو ہوائی جہازوں کی مدد سے تیار کیے گئے ہیں تو ہمیں آسانی سے اس حقیقت کا اندازہ ہو جائے گا کہ یہ ملک شروع میں باقی تمام دنیا سے کٹا ہُوا تھا اور خود سب کا مرکز معلوم ہوتا تھا۔

چین کے شمال اور جنوب میں بحرالکاہل واقع ہے، جو دُنیا کا فراخ ترین سمندر ہے۔

---

[1] MIDDLE KINGDOM [2] REPUBLIC [3] CH'IN

اہلِ چین کبھی بھی بحری مہم جُو نہیں رہے۔ ان کے پاس بڑے عمدہ بیڑے تھے، جس اور بہت سے چینی باشندے ماہی گیر بھی ہیں تاہم ان لوگوں نے کبھی دُور جا کر کسی دوسرے مُلک کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ وہ اپنی تھوڑی بہت زمین پر قانع رہے اور اسی کو جوتتے رہے۔ سمندر اُن کے لیے ہمیشہ ایک ناقابلِ عبور دیوار بنا رہا۔ حتّٰی کہ دوسروں نے اُسے عبور کیا۔ اس طرح چین کے دروازے دوسرے ممالک کے لیے کھلے۔ سب سے پہلے عربوں نے اِس سرزمین پر قدم رکھا۔ اُن کے بعد جاپانی آئے اور پھر اہلِ یورپ جن میں اہلِ پرتگال نے سبقت کی، لیکن وہ تھے بڑے وحشی۔ یہ سب لوگ چین سے کچھ لے جانے کی غرض سے آئے، اس لیے چینیوں نے اُن کے مُلکوں میں جانا اور اُن سے ملنا پسند نہ کیا۔

جنوب مغرب میں چین کی سرحد انڈوچین کے ساتھ ملتی ہے۔ دونوں کے درمیان استوائی گھنا جنگل ہے، جہاں ہر وقت ملیریا کا خطرہ رہتا ہے، اس لیے کوئی ادھر سے نہیں گذر سکتا۔

مغرب کی طرف چین کی سرحد ہندوستان کے ساتھ ملتی ہے جو سیکڑوں میل تک برما کے مشرقی کنارے کے ساتھ چلی گئی ہے۔ چین اور ہندوستان میں حالیہ چند برسوں کے سوا ہمیشہ دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ البتہ ناقابلِ عبور پہاڑوں نے انھیں ایک دوسرے سے جُدا رکھا ہے جن کی چوٹیاں اکثر برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ چین کے جو باشندے ہندوستان میں داخل ہُوئے انھیں کافی شمال میں بڑھ کر کوہ ہمالیہ کے تنگ درّوں سے گذرنا پڑا۔

دَورِ قدیم میں چین میں صرف شمالی سرحد سے داخل ہُوا جا سکتا تھا لیکن یہ بھی آسان نہ تھا کیونکہ یہاں صحرائے گوبی واقع ہے۔ اس کے باوجود چین پر سب سے پہلے اِسی طرف سے حملہ ہُوا۔ ابھی تک چینیوں کو اپنے تمام پڑوسیوں میں سے اتنی تکلیف کسی سے

نہیں پہنچی جتنی ایشیا کے گھاس کے میدانوں میں گھومنے پھرنے والے قبیلوں سے پہنچی۔ ان حملہ آوروں نے بار بار یہاں کی حکومتوں کو تاخت و تاراج کیا ہے۔ ریگستان اُن کی راہ میں حائل نہیں ہو سکے کیونکہ وہ خود ریگستان کے رہنے والے تھے۔ انہی کی وجہ سے چینی حکمرانوں کو اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ایک رکاوٹ کھڑی کرنی پڑی۔ یہ رکاوٹ تھی چین کی عظیم دیوار۔

تصاویر میں یہ دیوار نہایت مضبوط اور اچھی حالت میں نظر آتی ہے جیسے اُس پر وقت کا کوئی اثر نہیں ہُوا۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ کہیں کہیں سے یہ دیوار کٹ گئی ہے۔ اُدھر سے اب سڑکیں گزرتی ہیں۔ یہ دیوار ہر جگہ ایک جیسی نہیں کیونکہ وہ ایک وقت میں نہیں بنی تھی۔ مختلف شہنشاہوں نے مختلف وقتوں میں اس کے حصے تعمیر کرائے تھے اور پُرانوں کو درست کرایا تھا۔ اس کے قدیم ترین حصے شمالی صوبوں کے حکمرانوں نے اپنی حفاظت کے لیے تعمیر کرائے تھے۔ دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ چن خاندان (جس کی وجہ سے یہ مُلک چین کہلایا) کے ایک فرمانروا چن شی ہوانگ ٹی[1] نے ان حکمرانوں کے ساتھ مل کر اس دیوار کو مکمل کیا۔ اہلِ چین اس دیوار کو "دس ہزار میل لمبی دیوار" کہتے ہیں۔ چینی میل انگریزی میل کا ایک تہائی ہوتا ہے۔ یہ دیوار مع اپنے پیچ و خم کے پندرہ سَو میل سے کچھ زیادہ لمبی ہے۔ بعض جگہ اس کی اونچائی صرف پندرہ فیٹ ہے اور بعض جگہ پچاس فیٹ۔ دیوار کے زیادہ حصے کے ساتھ ایک بیرونی خندق کھدی ہوئی ہے۔ اس کا کچھ حصہ بڑی بڑی اینٹوں سے تعمیر ہُوا ہے اور جہاں کہیں پتھر ملے، وہاں پتھر استعمال کیے گئے۔ دریائے زرد کی جمع کی ہوئی باریک مٹی پر اس کی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ مٹی کو کھود کر پتھر کی بنیاد رکھی گئی۔ اندر کی طرف فوجوں کے قیام کے لیے مستقل کیمپ قائم کیے گئے تھے۔ شمالی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے یہ

---

[1] Ch'in Shih Huang Ti

دیوار ایک عظیم کوشش کا درجہ رکھتی ہے۔

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ پہلے خانہ بدوش لوگوں نے اور بعد میں دوسری اقوام نے چین میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اُن کے سامنے ایک وسیع مُلک تھا جس کے شمال اور مغرب میں میدان اور جنگلات ہیں۔ کہیں ریگستان تھے کہیں زرخیز وادیاں اور انتہائی مغربی حصّے میں نیم استوائی قسم کی نباتات پھیلی ہوئی تھی۔ ایشیا کا یہ گوشہ چاروں طرف سے محفوظ تھا، آب و ہوا معتدل اور مٹّی زرخیز تھی اور یہاں کے لوگ محنتی اور فن کار تھے۔ اس کے بیرونی صوبے تبّت اور سن کیانگ نیز منگولیا کے اندرونی اور بیرونی اضلاع ٹھنڈے، خشک اور کہیں کہیں کوہستانی تھے۔ وہ قدیم چین کا قلب تھے۔ آج ہم انھیں چین کے اٹھارہ صوبوں کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کے درمیان بھی ایسے پہاڑ نہیں تھے، جنھیں عبور نہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ دریاؤں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

تصوّر کیجیے کہ آپ چین کے کسی میدانی علاقے کے اُوپر اُڑ رہے ہیں۔ آپ وہاں کیا دیکھیں گے؟ پہاڑ جو زیادہ بلند نہیں ہیں اور لہریئے دار زمین۔ پہاڑوں کے عظیم سلسلے کہیں نظر نہیں آتے بجز ایک سلسلے کے جو مغرب سے مشرق کی طرف پھیلا ہُوا ہے اور ساحل پر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے کوہِ سن لنگ[1] کا سلسلہ جو بلند تر کوہِ کُن لُن سے جُدا ہو کر تبّت اور سن کیانگ کی طرف پھیلا ہُوا ہے۔ ایک سلسلۂ کوہ ہندوستان اور پاکستان کی طرف آ گیا ہے۔ کم پہاڑ ایسے ہیں جن پر گھنے جنگلات چھائے ہوئے ہیں۔ البتّہ کہیں کہیں بلند و بالا سیاہی مائل درختوں کے جُھنڈ نظر آتے ہیں جن کے نیچے مندر بنے ہوئے ہیں اور برابر میں مرگھٹ۔ زیادہ پہاڑیاں تقریباً ننگی ہیں، کچھ چٹانیں ہیں لیکن سب پر گھاس اُگی رہتی ہے۔ جنوب کی طرف کچھ پہاڑیوں پر بانس افراط سے اُگتا ہے۔ چین کے وسط میں بھی کچھ پہاڑ واقع ہیں، جن کی شکل لہریئے دار ہے۔

---

[1] Tsin Ling

صرف بلند پہاڑوں پر کاشت کاری نہیں ہوتی ورنہ جنوب کی پہاڑیاں تک سیڑھیوں کی شکل میں کاٹ دی گئی ہیں اور ان پر کاشت ہوتی ہے، ان پر پانی ٹھہر جاتا ہے۔ آپ کو حیرت تو ہو گی کہ انسان اپنے ہاتھوں سے زمین کی شکل کیوں کر بدل سکتا ہے، لیکن یہ ہے حقیقت۔ اہلِ چین صدیوں سے اپنے لیے ضرورت بھر غلّہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ آبادی اس قدر ہے کہ ہر جگہ آدمی ہی آدمی نظر آتے ہیں۔ جنگلات اور ریگستانوں تک میں انسان آباد ہیں۔ پورے چین میں حیات کے آثار ہویدا ہیں ـــــ ہر جگہ کھیت ہی کھیت اور جس جگہ کچھ پیدا نہیں ہو سکتا وہاں قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ شہر، دیہات، جھونپڑے، جھونپڑیاں اور اگر کوئی جگہ غیر آباد رہ جاتی ہے، تو وہاں بودھوں کا پگوڈا یا کسی دیوتا کا مندر تعمیر کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً "زمین آسمان کا دیوتا" اور غور سے دیکھیے! سامنے سرسبز وادی میں جو ایک سیاہ دھبّہ نظر آرہا ہے وہ اصل میں ایک کسان ہے جو چاول بو رہا ہے۔ دوسرا آہستہ آہستہ بازار کی طرف جا رہا ہے۔ مختلف رنگوں کے کپڑے پہنے ہُوئے وہ لوگ کوئی تہوار منا رہے ہیں اور اپنے خاندانی قبرستان سے واپس آ رہے ہیں۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی ہیں، متحرک اور مصروف۔

بڑی سڑکیں کم ہیں، اس لیے کاریں اور ٹرک بھی کچھ زیادہ تعداد میں چلتے پھرتے نظر نہیں آتے البتہ قدیم سڑکیں کافی ہیں لیکن وہ اوپر سے اچھی طرح دکھائی نہیں دیتیں۔ پگڈنڈیاں جیسی معلوم ہوتی ہیں۔ ایک نئی سڑک بن رہی ہے جو مغرب میں چنگ کنگ سے شروع ہو کر شمال میں روس تک چلی گئی ہے۔ ایک اور سڑک بلند پہاڑوں پر پیچ و خم کھاتی ہوئی برما تک چلی گئی ہے۔ کچھ نئی سڑکیں حال ہی میں تعمیر ہوئی ہیں جن کی مجموعی لمبائی پچاس ہزار میل کے قریب ہے۔ یہ روشنی ریلوے سٹیشنوں کی ہے۔ اہم ترین ریلوے لائن وہ ہے جو جنوبی حصّے کو ہانکو پر دریائے یانگ سٹی سے منسلک کرتی ہے اور دوسری شمال میں پیپنگ یا پیکنگ کو نانکنگ کے ساتھ ملاتی ہے جو اسی دریا پر ساحل کے قریب

واقع ہے۔

سورج تالابوں پر چمک رہا ہے جو جنوبی سرسبز خطّے میں ہیروں کی طرح دمک رہے ہیں لیکن شمال میں کچھ زیادہ نمایاں نہیں۔ ہر کھیت کے آس پاس ایک تالاب ضرور ہوتا ہے۔ کسان اُسی کا پانی استعمال کرتے ہیں۔ مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ ایک گہرا شگاف نظر آ رہا ہے جو اُس کے وسط تک پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اس پر بڑے بڑے بیڑے آہستہ آہستہ حرکت کر رہے ہیں۔ وہ پیکنگ کے قریب سے شروع ہو کر ہانگ کانگ تک چلا گیا ہے جو ایک قدیم اور خوب صورت شہر ہے۔ یہ شگاف اصل میں چین کی بڑی نہر ہے، جو حضرت مسیحؑ سے پانچ چھ صدی پہلے شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ پھر کھودی گئی اور کئی مرتبہ مرمّت ہوئی۔ اب اس کا صرف کچھ حصّہ استعمال ہوتا ہے، اس میں جہاز چلتے ہیں شمالی حصّہ خشک اور بھورا نظر آتا ہے۔ مکانات بھی کچھ نمایاں نہیں۔ البتّہ کہیں کہیں کوئی شہر دکھائی دے جاتا ہے۔ اس کے چاروں طرف دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ مکانات پر سیاہ رنگ کی کھپریلیں ہیں۔ چینی کے ٹائلوں والی یہ چھت ایک مندر کی ہے۔ یہاں کے کھیت جنوب کے کھیتوں کی طرح سرسبز و شاداب نہیں۔ آبی شاہراہوں کی کمی ہے، اس لیے کچھ سڑکیں تعمیر کی گئی ہوں گی۔ غالباً ایک سڑک پست پہاڑیوں پر بل کھاتی ہوئی گزر رہی ہے۔

شمالی ہموار میدان سے ایک دریا گزر رہا ہے۔ یہ دریائے زرد ہے جسے اہلِ چین اپنا غم کہتے ہیں کیوں کہ وہ اکثر اپنے کناروں کو توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔ اس پر کئی جگہ پشتے بندھے ہیں لیکن وہ اُنھیں بھی توڑ دیتا ہے اور کھیتوں کو تباہ کر کے ہزاروں افراد کو بے گھر بنا دیتا ہے۔ دریائے زرد چین کے دو بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ اس کی لمبائی ۲۷۰۰ میل ہے۔ وہ تبّت کے بلند پلیٹو سے نکلتا ہے لیکن اکثر اپنا راستہ بدلتا رہتا ہے۔ اس کا کچھ حصّہ پچاس سے پچھتّر گز چوڑا ہے اور وہاں اس کی رفتار تیز ہے۔ کہیں کہیں مشکوں کو پھلا کر اُن پر کچھ کشتیاں چلائی جاتی ہیں اور بعض جگہ اس میں کشتی رانی

بالکل نہیں ہو سکتی۔ اپنے آخری پانچ سو میل وہ میدانی علاقے میں طے کرتا ہے اور پھر سمندر میں گر جاتا ہے۔ یہاں اس کی تہہ مٹّی جمع ہو جانے کی وجہ سے عام سطح سے کافی بلند ہو گئی ہے۔ اس کے پانی کو روکنے کے لیے لوگوں نے یہاں اُونچے اُونچے پشتے تعمیر کیے ہیں۔ کہیں کہیں دریا آس پاس کی زمین سے کافی بلند ہو گیا ہے۔ یہاں سیلاب سب سے زیادہ تباہی مچاتے ہیں۔

جنوب میں نہروں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ سامنے جو سرسبز وادی ایک دریا کے دونوں طرف پھیلی نظر آ رہی ہے، وہ دریائے یانگ ٹسی کی وادی ہے اور چین میں سب سے زیادہ زرخیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی باغ ہے۔ یہ دریا مغرب میں تبت سے نکلتا ہے۔ وہاں اس کا نام "سنہری ریت کا دریا" ہے۔ یہاں دریا کی گذرگاہ تنگ اور گہری ہے۔ اس کی رفتار تیز ہے، اس لیے کشتی رانی خطرے سے خالی نہیں۔ اس حصّۂ دریا کی لمبائی ۱۵۷۰ میل ہے اور ڈھلان ۹½ فیٹ فی میل! اگلے سولہ سَو میل تک دریا میں کشتی رانی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں کچھ دقّت بھی پیش آتی ہے۔ یہاں دریا خوب صورت گھاٹیوں میں سے گذرتا ہے اور بڑے دلکش مناظر پیش کرتا ہے۔ آگے اچنگ[۱] نامی بندرگاہ ملتی ہے جو دخانی جہازوں کا مرکز ہے۔ اس سے آگے دریا میں آسانی سے جہاز چل سکتے ہیں۔ اس کی گہرائی تیس فیٹ سے سَو فیٹ تک اور کہیں کہیں اس سے بھی زیادہ ہے۔ ریت کے تودے بہت کم ہیں۔

آگے چل کر مشرق کی طرف ہمیں کئی بڑے شہر نظر آتے ہیں۔ تین شہر قریب قریب معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پر بڑے بڑے جہاز لنگر انداز ہیں۔ یہ یقیناً ہانکو ہے۔ اگرچہ ساحل سے اس کا فاصلہ تقریباً سات سَو میل ہے لیکن پانی چڑھنے کے وقت بحری جہاز آسانی سے یہاں تک آ جاتے ہیں۔

---

[۱] Iehang

دریائے یانگ ٹسی چین کا سب سے بڑا اور دُنیا کا چھٹا سب سے لمبا دریا ہے۔ اس کی لمبائی ۳٫۲۰۰ میل ہے۔ چین میں اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ ۷۵۶٫۵۰۰ مربع میل علاقہ اس سے سیراب ہوتا ہے اور یہیں سب سے زیادہ غلّہ پیدا ہوتا ہے۔

اس وسیع اور سرسبز وادی کے جنوب میں بہت سی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور دریا چشموں جیسے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سے تین ایک اور عظیم شہر کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ شہر کینٹن کے نام سے مشہور ہے۔ ان میں سے صرف ایک یعنی مغربی دریا میں جہاز رانی ہوسکتی ہے۔

مغربی صوبے ینان میں کچھ اور دریا ملتے ہیں لیکن وہ چین کی سرحد سے باہر نکل کر سمندر میں گرتے ہیں۔ یہاں پہاڑوں میں کچھ اُونچی پہاڑیاں اور چھوٹے پلیٹو نظر آرہے ہیں۔

اُوپر سے چین کا مُلک خوب صورت اور سرسبز معلوم ہوتا ہے لیکن ساحل کے قریب سمندر کا رنگ زرد ہے۔ اس کی وجہ چین کی زرخیز مٹّی ہے، جسے یہاں کے دریا اپنے ساتھ بہا لاتے ہیں۔ یہاں سمندر اتنا زرد ہو گیا ہے کہ اس کا نام ہی بحیرۂ زرد پڑ گیا۔

دوسرا باب

شمالی اور جنوبی چین کے باشندے

چین ایک نہایت قدیم ملک ہے۔ اس کی آبادی بہت زیادہ ہے جس کا ۸۵ فی صد حصّہ کاشت کاری کرتا ہے۔ اس سرزمین کا تصوّر اُس کے باشندوں کے بغیر محال ہے۔ یہ باشندے اس ملک کا حصّہ ہیں۔ اس کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں جسے یہاں کے بسنے والوں نے گذشتہ صدیوں میں کسی نہ کسی طرح تبدیل نہ کیا ہو۔ یہ لوگ زمین کے چپّے چپّے پر کاشت کرتے ہیں اور جہاں کاشت نہیں ہوسکتی وہاں قبرستان بنا دیئے جاتے ہیں۔ یعنی مرکر یہ لوگ اپنے ملک کی مٹّی میں مل جاتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے کھیت نہیں پائے جاتے بلکہ جابجا چھوٹے چھوٹے کھیت پھیلے ہُوئے ہیں جہاں بہت سے مرد اور عورتیں اپنی فصلوں پر جُھکے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ نیلے کپڑوں والے یہ لوگ اس سرزمین کا اُتنا ہی حصّہ ہیں جتنے ترکاریوں یا غلّے کے کھیت یا کسانوں کے کچّی دیواروں والے جھونپڑے۔

اگرچہ چین کی تاریخ ایک طویل تہذیب کی مسلسل تاریخ ہے اور اہلِ چین اپنی ثقافت کے اعتبار سے بہت کچھ ایک ہیں پھر بھی یہ ملک دو حصّوں پر مشتمل ہے جس کی وجہ یہاں کے جغرافیائی حالات ہیں۔ مارکو پولو جو تیرھویں صدی میں یہاں آیا تھا، شمالی اور جنوبی چین کے فرق سے اِس درجہ متاثر ہُوا کہ اس نے شمالی حصّے کا نام "کیتھے"[1] اور جنوبی حصّے کا نام "منجی"[2] رکھ دیا۔

شمالی حِصّہ خشک ہے۔ یہاں پانی کی قلت ہے۔ سال میں صرف چار چھ ماہ کاشت ہوسکتی

---

[1] Cathay　[2] Manji

ہے۔ اسی لیے یہاں سبزہ کم دکھائی دیتا ہے۔ پانی کی قلت یہاں کا عظیم مسئلہ ہے۔ دریائے زرد میں اکثر طغیانی آتی رہتی ہے لیکن چین کے شمالی میدانی حصّے کو اکثر خشکی کا سامنا رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ جنوبی حصّے میں رہنے والوں کی بہ نسبت غریب ہیں۔ زندگی سخت ہے اس لیے آبادی جنوب کے مقابلے میں کم گنجان ہے۔ شہروں نے زیادہ جگہ گھیری ہوئی ہے۔ اُن کی سڑکیں فراخ ہیں۔ درختوں اور گھاس کی کمی ہے۔ نہریں نہیں ہیں۔ دریائے زرد میں جہاز رانی نہیں ہو سکتی اس لیے حمل و نقل کے لیے دو پہیوں والی گاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں گدھے یا خچر کھینچتے ہیں۔ سمندر سے بھی کوئی مدد نہیں لی جا سکتی کیونکہ اچھی بندرگاہیں کم ہیں۔ ماہی گیری بھی زیادہ نہیں ہوتی۔

یہاں کی اہم فصلیں باجرہ، گیہوں، باقلہ اور باجرے کی قسم کا ایک اور اناج کیاؤلیانگ ہے۔ چونکہ گیہوں کی قیمت اچھی اٹھتی ہے، اس لیے اس کا زیادہ حصّہ باہر بھیج دیا جاتا ہے اور لوگ باجرے پر گذارا کرتے ہیں۔

شمالی اور جنوبی چین کے باشندے بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ اوّل الذکر کے جسم میں منگولی خون موجود ہے۔ وہ دراز قامت اور فراخ ہوتے ہیں۔ ان کی رنگت سیاہ ہوتی ہے۔ وہ نسبتاً سست واقع ہُوے ہیں اسی لیے جنوب کے چاق و چوبند لوگ ان پر ہنستے ہیں اور بعض اوقات انھیں بے وقوف یا کم از کم سیدھا ضرور کہتے ہیں لیکن مغربی نقطۂ نظر سے یہ لوگ بے وقوف نہیں ہیں۔ چین کے بعض علماء اسی خاک سے اُٹھے۔ صدیوں تک شمالی چین کا شہر پیپنگ علم و فضل اور ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ شمال کی زبان تقریباً ایک جیسی ہے اور ماندرین کہلاتی ہے۔ یہی یہاں کی قومی زبان ہے۔ شمالی چین عارفوں اور فرزانوں کا مرکز رہا ہے۔

چین کے تمام دیہاتوں میں سب لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ حسبِ ضرورت مکانوں میں توسیع کر لی جاتی ہے لیکن درمیان میں صحن کے لیے تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ بعض

اوقات ایک مکان کئی عمارتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر ایک کے صحن کے چاروں طرف دیوار کھنچی ہوتی ہے اور یہ عمارتیں ایک دوسرے کے پیچھے واقع ہوتی ہیں۔

موسم سرما طویل ہوتا ہے۔ اس وقت کام کاج بھی زیادہ نہیں ہوتا، اس لیے شمالی چین کے باشندے گھروں کے اندر ہی آرام کرتے ہیں۔ ان کچّے مکانوں میں چارپائیاں نہیں ہوتیں بلکہ اینٹوں کے چبوترے بنے ہوتے ہیں جو "کانگ[1]" کہلاتے ہیں۔ انھیں گرم رکھنے کے لیے اُن کے نیچے دھیمی آنچ رکھی جاتی ہے۔ سب گھر والے ایک ہی کانگ پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں، کھیلتے ہیں اور تمباکو پیتے ہیں۔ باورچی خانے خاص طرز کے ہوتے ہیں جن میں اینٹوں یا کچّی مٹّی کے چولھے بنے ہوتے ہیں۔ کھانا پکانے کے برتن اُن پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ وہ آگ سے تقریباً مل جاتے ہیں جو آہستہ آہستہ جلتی رہتی ہے اور چولھے کے پچھلے حصّے سے روشن کی جاتی ہے۔ اس قسم کے دو تین چولھے ہوتے ہیں۔ گرم پانی کا ذخیرہ الگ ہوتا ہے۔ چولھے کے پیچھے بڑی اچھی نواس رہتی ہے۔ ایک گوشے میں ایندھن کا ڈھیر ہو جاتا ہے جو پہاڑی گھاس یا زمین سے نکالی ہوئی جڑوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بیٹھنے کے لیے ایک چوکی پڑی رہتی ہے۔ یہ گوشہ سب سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں ایندھن کے لیے کچّا اور پکّا کوئلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اُسے انگیٹھی میں ملا کر اس پر کھانا پکایا جاتا ہے۔

صاحب استطاعت لوگوں کے گھروں میں سامنے ایک بیٹھک ہوتی ہے جہاں مہمانوں کا استقبال کیا جاتا ہے۔ دروازے کے بالمقابل ایک مربّع میز رکھی ہوتی ہے جس پر گھر کے افراد اور مہمان کبھی کبھی کھانا بھی کھاتے ہیں۔ عام طور سے اِس میز کے چاروں طرف دو یا چار کُرسیاں بھی ہوتی ہیں۔ میز پر ایک دو گلدان، مٹھائی کی طشتریاں یا کوئی ہلکی غذا اور پھُولوں کی ٹوکری رکھی ہوتی ہے۔ میز کے اُوپر دیوار کے وسط میں ایک لمبا طغرا آویزاں ہوتا ہے، جس پر بزرگوں کے نام لکھے ہوتے ہیں یا چاروں موسموں کی چڑیوں اور پھُولوں کے خاکے

---

[1] K'angs

ہوتے ہیں جنھیں لوگ پسند کرتے ہیں یا کسی دانا کے اقوال خوش خط لکھے ہوتے ہیں۔

جاڑوں میں شمال کے رہنے والے موٹا لبادہ پہنتے ہیں جو اُن کے ٹخنوں تک آتا ہے۔ بڑے بڑے جُوتوں میں گدّیاں یا کھال کا استر لگا ہوتا ہے اور سر پر پوستین کا ٹوپا ہوتا ہے جو کانوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ ضرورت کے مطابق کان کھولے بھی جا سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کے لبادے میں بھیڑ کی کھال کا استر بھی لگا ہوتا ہے جس میں چلتے وقت بل پڑتے رہتے ہیں۔ چینی لوگ پوستین کو باہر کی طرف کبھی نہیں پہنتے ماسوا مغربی انداز کے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ پوستین اندر کی طرف رکھ کر ہی وہ اس کی ملائمت اور حرارت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

عورتیں بھی نرم یا پوستین کے استر والا لباس پہنتی ہیں۔ پرانے طرز کا چھوٹا کوٹ اور چوڑے پائنچے والا پاجامہ اب متروک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی جگہ مردانہ چغہ لے رہا ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ ذرا چست بنایا جاتا ہے۔ خواہ وہ سیاہ سُوتی کپڑے کا ہو یا خوبصورت ریشم یا ساٹن کا۔ عورتیں جب کام کرتی ہیں تو اپنے سر پر ایک رومال باندھ لیتی ہیں اور جب باہر نکلتی ہیں تو اس کی جگہ ایک چھوٹا سا ہیٹ پہن لیتی ہیں جس پر کہیں کہیں ایک دو خوب صورت پتّھر جڑے ہوتے ہیں یا ننگے سر ہوتی ہیں۔ ان کے بال ترشے ہُوے اور لہریے دار ہوتے ہیں۔

گرمیوں میں شمالی اور جنوبی دونوں حصّوں کے لوگ یکایک دُبلے معلوم ہونے لگتے ہیں، کیونکہ اُن کی پھُولی ہوئی پوشاک اُتر جاتی ہے اور وہ اکہرے کپڑے پہن لیتے ہیں۔ عام کہاوت ہے کہ اگر کوئی بچّہ جاڑوں میں اتنا بڑا ہو جائے کہ وہ چلنا پھرنا سیکھ سکتا ہے تب بھی اُسے گرمیوں تک انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ جاڑوں میں اس کے جسم پر اتنا موٹا لبادہ لدا ہوتا ہے کہ وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ جاڑوں میں ہر جگہ مائیں اپنے بچّوں کی طرف دوڑتی نظر آتی ہیں۔ جب کوئی بچّہ گر جاتا ہے تو وہ ماں کی مدد کے بغیر کھڑا نہیں ہو سکتا۔

شمالی چین کے اکثر گھروں میں ہزاروں گز سویاں کپڑوں کی طرح سوکھتی نظر آتی ہیں۔ سویاں ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد انھیں خشک کرکے جمع کر لیا جاتا ہے یا بازار میں فروخت کردیا جاتا ہے۔ یہ کام بڑی ہوشیاری کے ساتھ کیا جاتا ہے تاکہ ذرا سی مقدار بھی ضائع نہ ہو۔ وہاں اکثر آندھی آتی رہتی ہے جس کی وجہ سے سویاں گرد آلود ہوجاتی ہیں لیکن اس سے مفر نہیں۔

جب گرما گرم سویاں تھوڑی سی نمکین ترکاری یا لہسن کے ساتھ کھائی جاتی ہیں تو بڑا لطف آتا ہے لیکن باجرے کی روٹی زیادہ عام ہے۔ اس میں خمیر یا نمک شامل نہیں کیا جاتا۔ چپاتیوں میں کٹی ہوئی ترکاری لپیٹ کر انھیں چولھے میں پکا لیتے ہیں۔ خمیری روٹی تل شامل کرکے بھی تیار کی جاتی ہے۔ آپ کسی بھی دن کسان کو اپنے کھیت کی مینڈھ پر بیٹھے اور اپنے پٹکے سے یہ روٹی نکال کر مزے کے ساتھ کھاتے دیکھ سکتے ہیں۔ شمال اور جنوب دونوں حصّوں کے باشندے چائے پیتے ہیں۔

بارش اور پانی کی افراط اور عمدہ آب و ہوا کی وجہ سے چین کا جنوبی حصّہ شمالی خشک حصّے کے مقابلے میں سرسبز و شاداب ہے۔ شمالی حصّے میں سال بھر میں صرف ایک فصل پیدا ہوتی ہے لیکن جنوبی حصّے میں دو تین فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔ یہاں کی مٹّی زیادہ زرخیز ہے۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر بھی کچھ نہ کچھ بو دیا جاتا ہے۔ جنوبی چین کا ساحل اچھا ہے اور یہاں کئی عمدہ بندرگاہیں واقع ہیں۔ ماہی گیری یہاں کی اہم صنعت ہے۔ سمندر کے علاوہ اندرونِ ملک میں بھی مچھلیاں کافی تعداد میں پکڑی جاتی ہیں۔ آبادی نہایت گنجان ہے۔ پھر بھی یہاں کے لوگ شمالی حصّے کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہیں۔

جنوبی چین میں بھینس اور زرد گائے سے کھیتوں پر کام لیا جاتا ہے۔ یہ جانور سُست اور کم عقل ضرور ہوتے ہیں لیکن اتنے قوی ہوتے ہیں کہ کسان انہی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ بہت سی دیہاتی سڑکوں پر پن پتھر یا دوسرے پتھر بچھے ہوتے ہیں۔ آمد و رفت

اور حمل و نقل کے لیے ڈولی یا ہتھ گاڑی استعمال کی جاتی ہے۔ لوگ بہت سی چیزیں اپنی کمر پر بھی لاد لیتے ہیں۔ سامان لے جانے کے لیے کشتیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں جو بادبانوں، چپّو یا بانس کی مدد سے چلتی ہیں۔ اب موٹر گاڑیوں کا رواج بڑھ رہا ہے۔

جنوبی چین کے شہر شمالی حصّے سے مختلف ہیں۔ یہ زیادہ گنجان ہیں، سڑکیں اور محلّے تنگ ہیں اور بازاروں میں کاروبار کی گہما گہمی رہتی ہے۔ زیادہ تر مکانات پختہ ہیں۔ چھتوں پر پختہ کھپریل ڈالی جاتی ہے۔ کہیں کہیں کوئی مندر بھی نظر آجاتا ہے جس میں چینی مٹّی کے ٹائل بچھے ہوتے ہیں اور فراخ صحن میں بہت سے سایہ دار درخت لگے ہوتے ہیں۔

یہاں بانس خودرُو ہے اور ہزاروں کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مکانات کی تعمیر، گھر کے برتن، فرنیچر اور ماہی گیروں کے بادبان اور دیگر ساز و سامان میں۔ اس کی کونپلیں پکا کر کھائی جاتی ہیں۔ ٹوکریاں، بالٹیاں اور بہنگیاں وغیرہ سب کی سب بانس کی ہوتی ہیں۔

جنوبی چین کے کھیت شمالی حصّے کی بہ نسبت کہیں زیادہ نفع بخش ہیں۔ مکانات اکثر اینٹوں اور کھپریلوں سے تعمیر کیے جاتے ہیں اور ان میں سایہ دار درخت لگائے جاتے ہیں۔ مُرغیاں پالنے کا عام رواج ہے اور زندگی کی گہما گہمی ہر سُو نظر آتی ہے۔

پہاڑیاں ہوں یا میدان، ہر جگہ سبزہ نظر آتا ہے۔ جب موسمِ بہار میں چاول بو دیا جاتا ہے تو اس کی دھانی رنگت سے زیادہ دل کشی کسی اور چیز میں نہیں ہوتی۔ دیہاتوں کے قریب سرو اور دوسرے سائے دار درخت قبروں پر چھائے رہتے ہیں۔ تالابوں میں اکثر کنول اور سرسبز بیلیں پھیلی رہتی ہیں۔

جنوبی چین کی اہم پیداوار چاول ہے لیکن بہت سے حصّوں میں موسمِ خزاں میں گیہوں بھی بویا جاتا ہے اور چاول بونے سے پہلے کاٹ لیا جاتا ہے۔ تیل کے لیے تل اور سرسوں وغیرہ کی کاشت کی جاتی ہے۔ موسمِ بہار میں سرسوں کے زرد کھیت عجب بہار دکھاتے ہیں۔ باقلہ بھی اکثر بویا جاتا ہے اور کثرت سے کھایا جاتا ہے۔ بعض اوقات کھیتوں پر چمن کا گمان

ہوتا ہے۔ انتہائی جنوب میں چائے کی کاشت ہوتی ہے۔ چائے کے پودے پہاڑی ڈھلانوں کو ڈھک لیتے ہیں۔ تُن کے درخت بھی کافی لگائے جاتے ہیں۔ ان کے پھلوں کی گری سے رنگوں میں استعمال ہونے والا تیل حاصل کیا جاتا ہے۔ شہتوت کے درختوں پر ریشم کے کیڑے پالے جاتے ہیں۔

جنوبی چین کے لوگ پست قامت لیکن گٹھیلے جسم کے ہوتے ہیں۔ ان کا رنگ کھلا ہُوا، آنکھیں تیکھی اور اُبھری ہوئی ہوتی ہیں۔ شمالی چین کے باشندوں سے ان کے خدوخال مختلف ہوتے ہیں۔ دونوں حصّوں کے لوگوں کی آنکھوں پر کھال بل کھائے رہتی ہے۔ یہ ان کی خصوصیت ہے۔ جنوبی چین کے لوگ حرکات و سکنات اور رفتار و گفتار میں تیز ہوتے ہیں۔ ان کے ذرائع حمل و نقل شمالی چین کے مقابلے میں تیز رفتار ہیں۔ پھر بھی ہر علاقے کی زبان اور لہجہ مختلف ہے۔ تھوڑے سے فاصلے کے بعد ہی دونوں بدل جاتے ہیں چند سال گزرے ڈاکٹر ہُوشی[1] نے ایک مشترکہ قومی زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی تھی جو "پے وا"[2] کہلاتی ہے اور انھیں کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی۔ کینٹن کے لوگ بیرونی تجارت میں پیش پیش ہیں اور دنیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچے ہیں۔

چین کے زیادہ تر انقلابات جنوبی چین سے شروع ہوئے ہیں ڈاکٹر سن یاٹ سین، قائدِ جمہوریت اسی خاک سے اُٹھا۔

جنوبی چین کے شہر شمال کے فراخ، تقریباً غیر آباد اور ہوادار شہروں سے کافی مختلف ہیں۔ یہاں زندگی کی گہما گہمی دیکھنے میں آتی ہے۔ لوگ ڈولیوں، رکشاؤں، ہتھ گاڑیوں، پیدل یا سائیکلوں پر آتے جاتے ہیں۔ دوکان دار اپنا سودا بیچنے کے لیے آواز لگاتے ہیں۔ شمال کی طرح یہاں بھی خط لکھنے والے سڑکوں کے کونوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ

---

[1] Dr. Hu Shih [2] Peh hwa

عورتیں بھی اپنی مرضی کے مطابق انہی سے خط لکھواتی ہیں۔ بازاروں میں ہر طرح کی ترکاریاں اور پھل نظر آتے ہیں۔ ٹوکریوں اور ناندوں میں طرح طرح کی مچھلیاں بھری ہوتی ہیں۔ تمام دوکانیں سڑکوں پر کھلتی ہیں۔ رات کو ان کے سامنے تختے لگا دیے جاتے ہیں جو صبح کو ہٹا دیے جاتے ہیں۔ کھانے کی دوکانوں پر کھانا، دواؤں کی دوکانوں پر جڑی بوٹیاں اور دوسری دوائیں، اناج کی دوکانوں پر اناج کے ڈھول، شراب کی دوکانوں پر شراب کے مرتبان اور کپڑے کی دوکان پر ریشم کے تھان پھیلے نظر آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے ایک ساتھ بولنے سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ کسی عمارت کی دوسری منزل سے چائے والے کی آواز آتی ہے جہاں لوگ جمع ہوکر سستاتے ہیں اور آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ چائے کی یہ دوکانیں شمالی اور جنوبی دونوں حصوں میں پائی جاتی ہیں لیکن شمال کے لوگ شور کم مچاتے ہیں اور آہستہ رَو ہوتے ہیں۔

جنوبی چین کے مکانات میں سونے کی جگہ کو گرم رکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہاں بانس یا کسی دوسری لکڑی کی چارپائیاں استعمال کی جاتی ہیں جنھیں رسّی سے بُن لیا جاتا ہے۔ گھروں میں اکثر خوب صورت پردے ڈالے جاتے ہیں، جو دلہن جہیز میں اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اندرونی ترتیب بہت کچھ شمالی گھروں جیسی ہی ہوتی ہے۔ صحن کے چاروں طرف دیوار ہوتی ہے اور ہر دو مکانات کے درمیان صحن ہوتا ہے۔ یہ صحن سائے دار اور ہوادار ہوتے ہیں، بچّے اسی جگہ کھیلتے ہیں، ان کی مائیں سینے پرونے، کھانے پکانے اور گھر کے دوسرے دھندوں میں مصروف رہتی ہیں۔ مرد بھی صحن میں ہی بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں اور حُقّہ پیتے ہیں۔ دادی یا نانی امّاں بھی یہیں ہی بیٹھ کر اپنا گز بھر لمبا پائپ پیتی ہیں اور کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا!

چاول دن میں تین بار کھایا جاتا ہے۔ ناشتے پر اس کا دلیا بنایا جاتا ہے

اور نمک مسالے ملا کر کھایا جاتا ہے۔ شام کے لیے خشکہ تیار کیا جاتا ہے اور گرماگرم ترکاریوں، تھوڑی سی مچھلی یا گوشت کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ شام کو بھی تقریباً یہی صورت رہتی ہے۔ چین کے زیادہ تر حصّے میں دن میں دو کھانے تیار ہوتے ہیں۔ جنوب میں کہیں کہیں روٹی بھی کھائی جاتی ہے لیکن چاول کے علاوہ شمالی اور جنوبی دونوں حِصّوں میں مٹھائی بہت کم کھائی جاتی ہے۔ اہلِ چین کو مغربی کھانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہوتا ہے کہ ان میں میٹھا بہت ہوتا ہے۔ شاید شکر کی کمی، سادہ غذا اور گرم پانی میں پڑے ہوئے تولیے سے باربار چہرہ صاف کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اہلِ چین کی رنگت نہایت صاف ستھری ہوتی ہے۔ چینی لڑکیاں خواہ شمال کی ہوں یا جنوب کی اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہیں۔ ان کے بال گہرے سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں۔ رنگ کھُلا ہوتا ہے، آنکھیں سیاہ اور چمکیلی اور ہاتھ سڈول ہوتے ہیں —— دنیا میں اتنے خوب صورت ہاتھ شاید کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتے۔

چین کے لاکھوں باشندے خشکی پر نہیں بستے، بلکہ کشتیوں میں اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ جنوب مشرقی ساحل کوہستانی ہے۔ اس لیے وہاں پیداوار زیادہ نہیں ہوتی۔ ساحل پر بندرگاہوں کی کثرت ہے۔ پہاڑوں پر جو لکڑی پیدا ہوتی ہے وہ جہاز سازی کے کام آتی ہے۔ اسی لیے یہاں کے لوگ کشتیوں میں رہتے بستے ہیں۔ فوچو اس کی ایک مثال ہے۔ ہزاروں آدمی ہر وقت کشتیوں پر سوار رہتے ہیں۔ وہ کہیں جاتے نہیں کیونکہ شہر میں اتنی گنجائش بھی نہیں کہ وہ وہاں رہ سکیں۔ امریکی شہروں میں بھی کچھ لوگ کیمپوں میں رہتے ہیں۔ پورے جنوبی چین میں آپ کو آبادی کا کچھ حِصّہ اسی طرح کشتیوں میں آباد نظر آئے گا۔ یہ لوگ اپنی کشتیوں میں سامان اور مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا کر کچھ روزی بھی کما لیتے ہیں۔ لیکن اکثر اوقات وہ ساحل پر جا کر کچھ کام کاج کرتے ہیں یا کوئی کھیت جوتتے ہیں اور رات کو پھر اپنی کشتی پر واپس آجاتے ہیں۔

ساحلِ سمندر پر لوگوں کا خاص پیشہ ماہی گیری ہے۔ خاص طور سے شنگھائی کے جنوب میں جہاں چھوٹے چھوٹے جزیرے پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہزاروں ننّھے ننّھے بیڑے سمندر میں حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ ساحل کے قریب چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور صدفے پکڑے جاتے ہیں۔ ان بیڑوں کو خوب سجایا جاتا ہے اور ان پر بانس کی کھپچیوں کے بادبان لگائے جاتے ہیں۔ وہ ساحل سے دُور نکل جاتے ہیں۔ لیکن دو تین دن سے زیادہ نہیں، پھر بھی وہ اتنی مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں کہ ان سے قومی دولت میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شنگھائی کے جنوب میں ننگ پو نامی ایک ساحلی شہر واقع ہے۔ وہاں کی مچھلیاں سارے چین میں مشہور ہیں۔ دعوتوں میں یہی مچھلی نمک کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ مختلف بندرگاہوں کے درمیان لکڑی لانے لے جانے کے لیے بھی بڑی کشتیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ جن لوگوں نے دخانی کشتیوں یا جہازوں کو چلانے کا فن سیکھ لیا، وہ لاکھوں کی تعداد میں ملایا، انڈوچین اور جزائر شرق الہند کو منتقل ہو چکے ہیں۔

عام چینی کشتی تنگ لیکن مضبوط ہوتی ہے۔ وہ بھاری چکنی کڑیوں سے بنائی جاتی ہے۔ سامنے کے حصّے میں بانس کی چٹائیوں کا ایک چھوٹا سا حجرہ ہوتا ہے، جس پر بادبان لگا ہوتا ہے۔ دوسری طرف کشتی راں اپنا چپّو لے کر بیٹھتا ہے۔ جب بادبان استعمال نہ کیا جا رہا ہو یا کشتی کسی پُل کے نیچے سے گذر رہی ہو تو مستول کو مع کمرے کی چھت کے پیچھے کی طرف گرا دیا جاتا ہے۔ جب مستول کھڑا ہو جاتا ہے تو وہ پوری کشتی پر چھا جاتا ہے۔ جب کشتی کسی تنگ چشمے یا نہر سے گزرتی ہے تو اُس کی رفتار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ کھیت میں کام کرنے والا کسان یہ سمجھتا ہے کہ کوئی دخانی جہاز خشکی پر چڑھتا چلا آ رہا ہے۔

کشتیوں میں رہنے والے لوگ خواہ وہ اندرونِ ملک کے چشموں اور نہروں پر آباد

ہوں یا ساحلِ سمندر پر، سب کے سب خوش مزاج ہوتے ہیں۔ جو لوگ پڑوسی ملکوں کی سیر کر آتے ہیں، ان کا زاویۂ نگاہ فراخ تر ہو جاتا ہے اور جو ملّاح اپنے علاقے میں ہی گھومتے رہتے ہیں اُنھیں بھی دوسرے فرقوں اور دیہاتیوں سے ملنے کا اتفاق پیش آتا ہے۔ خشکی پر بسنے والوں کی بہ نسبت انھیں زندگی کا زیادہ تجربہ ہوجاتا ہے لیکن جب جاپان نے چین پر حملہ کیا یا جب اس ملک میں انقلاب برپا ہُوا تو اہلِ چین کو دوسری اقوام سے ملنے کا کہیں زیادہ موقع میسّر آیا۔

عوامی جمہوریۂ چین یعنی کمیونسٹ حکومت کے تحت اس ملک میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ شمالی چین اور جنوبی چین پر بالآخر ان تبدیلیوں کا کیا اثر پڑے گا۔

تیسرا باب
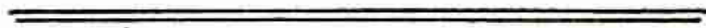
چین کی تاریخ کے ابتدائی اوراق

(۲۲۰ئہ تک)

چین کے پینتالیس کروڑ انسانوں کی کہانی اس زمانے سے شروع ہوتی ہے، جب تاریخ لکھنے کا رواج شروع نہیں ہُوا تھا۔ اس عظیم قوم کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ یہاں اتنی کثیر آبادی کس طرح ہو گئی کہ ایک مربع میل قابلِ زراعت رقبے میں اوسطاً ڈیڑھ ہزار انسان رہتے ہیں۔

چینی باشندے کہتے ہیں کہ شروع میں ان کے ملک میں بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ دو قوتیں ظاہر ہوئیں۔ یانگ[۱] اور ین[۲] جو مل کر ہر چیز کی تکمیل کرتی ہیں۔ یہ لوگ ان قوّتوں کو ایک دائرے سے ظاہر کرتے ہیں جو دو حصّوں میں بٹا ہوتا ہے، ایک سیاہ اور دوسرا سفید۔ یہ علامت آرائش کے لیے اکثر استعمال کی جاتی ہے۔ یان چمک، حرارت، عمل اور مردانگی کا ترجمان سمجھا جاتا تھا۔ ین تاریکی، کاہلی، خنکی اور نسوانیت کا منبع تھی۔

عرصۂ دراز کے بعد یان اور ین سے ایک خرافاتی انسان پیدا ہُوا، جس کا نام پان کو[۳] تھا۔ وہ زمین بن گیا اور اس نے اپنی خوشنودی کے لیے سُورج، چاند اور ستارے بنائے۔ اس کا سر پہاڑوں کی شکل میں ظاہر ہُوا، اس کی سانس سے بادل

---

[۱] Yang [۲] Yin [۳] P'an Ku

بنے ، اس کی آواز بجلی کی گرج بن کر سنائی دی ، اس کی رگوں نے دریاؤں کی شکل اختیار کی ، اس کی کھال اور بال بڑے بڑے درختوں کی شکل میں ظاہر ہوئے اور اس کے دانت اور ہڈیاں دھاتیں بن کر زمین کے اندر چھپ گئیں۔ اس کے جسم پر کچھ کیڑے مکوڑے رینگنے لگے۔ یہ تھے انسان!

اس آدمی کے تین مددگار تھے۔ایک اژدہا، دوسرے ایک عجیب چڑیا جس کا نام عنقا تھا اور ایک دیوقامت کچھوا۔ ان میں اژدھے کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بارش جس سے فصلیں اُگتی ہیں، نیکی اور قوّت کا نشان بن گیا بلکہ اُسے قومی نشان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ چینی قوم میں اسے سیکڑوں سال تک وہی عظمت وحیثیت حاصل رہی جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں عقاب کو ہے۔ شاہی تخت کا نام بھی اژدھے کے نام پر پڑ گیا۔ انقلاب آنے تک چین کا جھنڈا زرد رنگ کا رہا جس پر ایک بڑا سیاہ اژدھا بنا ہوتا تھا۔

چینی باشندے عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ ان میں پانچ مختلف اقوام شامل ہیں۔ انقلاب کے بعد ۱۹۱۱ء میں یہاں کے جھنڈے پر ان کی ترجمانی کی گئی۔ اس پر پانچ چوڑی دھاریاں تھیں۔ چن کے لیے سُرخ، منچو کے لیے زرد ، منگولوں کے لیے نیلی، ترکوں کے لیے سفید اور تبتیوں کے لیے سیاہ۔

آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا خیال ہے کہ چینی تہذیب کا نشان گذشتہ ساڑھے تین ہزار سال تک ملتا ہے۔ اس زمانے میں چین کے شمالی میدان میں رہنے والے لوگ فنِ زراعت سے آگاہ تھے، ان کے دیہاتوں میں پنچائتی طرزِ حکومت کا رواج تھا اور وہ بہت سے فنون جانتے تھے۔ جب ۱۹۲۹ء میں ما قبلِ تاریخ کے "پیکنگ انسان" کی ہڈیاں دستیاب ہوئیں تو ماہرین کو خیال ہُوا کہ چین میں دنیا کے بعض دوسرے ملکوں کی طرح نہایت قدیم دَور میں بھی انسانی آبادی موجود تھی۔

روایات سے پتہ چلتا ہے کہ چین پر سب سے پہلے ۲۲۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ ہسیا[1] خاندان کی حکومت تھی لیکن سب سے پہلا تحریری ریکارڈ شانگ[2] خاندان کے متعلق سیپیوں اور ہڈیوں پر کندہ ملا ہے۔ اس خاندان نے ۱۷۰۰ ق م سے ۱۱۰۰ ق م تک حکومت کی۔

چین کی تاریخ دراصل چَو[3] خاندان سے شروع ہوتی ہے جس نے یہاں ۱۱۰۰ ق م سے ۲۵۰ ق م تک حکومت کی۔ اس زمانے کا چین ابھی تک دریائے زرد کے میدان میں موجود تھا۔ ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ لوگ کہاں سے آئے تھے لیکن اس زمانے کے کانسی کے کچھ مجسّموں سے سیتھی[4] اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس زمانے میں روس سیتھیوں کے قبضے میں تھا اور یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ انھوں نے جنوب کی زرخیز سرزمین تک اپنا اثر بڑھایا ہوگا۔ اس وقت اس میدان کا بہت سا حِصّہ خالی پڑا تھا۔ سیتھی باشندے بہت سے اُن اناجوں سے واقف تھے جو آج اہلِ چین کی خوراک ہیں۔ وہ ریشم کے کیڑے پالتے تھے اور ان کے لیے شہتوت کے درخت لگاتے تھے، ان کے پاس پالتو جانور موجود تھے اور وہ کئی پودوں سے کپڑا تیار کرنا بھی جانتے تھے۔ اس وقت تک کانسی کافی پُرانی چیز ہو چکی تھی۔ البتّہ لوہا اسی زمانے میں استعمال ہونا شروع ہُوا۔

زراعت بڑی احتیاط کے ساتھ کی جاتی تھی۔ زمین کو اس طرح تقسیم کیا گیا تھا کہ آٹھ آٹھ کسانوں کی جماعتیں برابر برابر زمین لے کر اس میں کاشت کاری کرتی تھیں اور نواں حِصّہ زمیندار یا آقا کے لیے جوتا بویا جاتا تھا۔ جاڑوں میں یہ لوگ اپنے

---

[1] Hsia   [2] Shang   [3] Chou

[4] Scy Thian سیتھی، باشندۂ سیتھیا۔ سیتھیا بحیرۂ اسود، بحیرۂ خضر اور بحیرۂ ارال کے شمالی کا قدیم نام تھا۔

وطن واپس چلے جاتے تھے، جہاں ان کا گھر ہوتا تھا۔ وہیں ان کا مکھیا اور منصف رہتا تھا۔ ان لوگوں نے دراصل چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں قائم کر رکھی تھیں۔

یہ لوگ موسم بہار میں تیوہار مناتے تھے اور شادیاں کرتے تھے۔ ایک گاؤں میں کئی گھرانے آباد ہوتے تھے لیکن شادی کرتے وقت یہ احتیاط برتی جاتی تھی کہ دولھا دلھن کا خاندانی نام ایک نہ ہو، البتہ دو بھائیوں یا دو بہنوں کے بچّوں کی آپس میں شادی ہو سکتی تھی کیونکہ ان کے نام مختلف ہوتے تھے۔ شادی کی اہمیّت بہت زیادہ تھی۔ اس کا تعلق صرف دو افراد سے نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے قبیلے سے ہوتا تھا۔

ملک کا حاکم وانگ[1] یا بادشاہ کہلاتا تھا۔ اس کی قلمرو مختلف صوبوں میں بٹی ہوتی تھی۔ بادشاہ کے مختلف ملازمین کے لیے بہت سے تکریمی خطابات استعمال ہوتے تھے لیکن چونکہ فاصلے نہایت طویل اور ذرائع حمل و نقل نہایت سُست تھے یعنی گھوڑے، رتھ وغیرہ، اس لیے جگہ جگہ لوگوں کی اپنی حکومتیں قائم تھیں۔

چو خاندان میں عظیم مفکّر پیدا ہوئے۔ انھوں نے حضرت مسیحؑ سے پانچ چھ سو سال قبل نہ صرف چین کو متاثر کیا بلکہ پوری دُنیا پر اثر انداز ہوئے۔ ان کے فلسفے کا اثر ہنوز جاری ہے۔ ہم انھیں فلسفی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جنھیں علم سے پیار تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت چین میں کتنی کتابیں موجود تھیں اور کیا کتابوں کے بغیر علما فضلا پیدا ہو سکتے ہیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابوں کے بغیر بھی بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے ہیں لیکن چین میں اس وقت کتابوں کا رواج شروع ہو چکا تھا۔ غالباً بانس کی کتابیں اس سے بھی پہلے عام ہو چکی تھیں۔ بانس کی تختیوں یا دھجیوں پر روغن سے عبارت لکھ دی جاتی تھی اور انھیں چمڑے کے تسمے سے آپس میں

---

[1] Wang

سی دیا جاتا تھا۔ یہ کتابیں بڑی بھاری بھرکم ہوتی تھیں۔ بعض اوقات پورے کمرے میں ایک ہی کتاب سماتی تھی۔

ابتدائی طرز کی اِن کتابوں میں حمدیں، نغمے اور ایسی نظمیں محفوظ ہوتی تھیں، جو خاص خاص موقعوں پر پڑھی جاتی تھیں۔ سرکاری لین دین کا حساب بھی رکھا جاتا تھا۔ طریقِ حکومت بھی لکھا جانے لگا اور سیاسی فلسفے کی ابتدا ہوئی۔

چین کا سب سے بڑا فلسفی ۵۵۱ ق م کے قریب پیدا ہُوا۔ اُس کا نام کنفوشیس تھا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور اس کی بیوہ ماں نے اُسے پالا پوسا۔ وہ بڑا اچھا طالب علم ثابت ہُوا۔ اُسے تاریخ اور رسومِ حکومت سے خاص طور پر دلچسپی تھی۔ بڑا ہو کر وہ اپنے صوبے کا افسر ہوگیا اور اعلیٰ ترین منصب تک پہنچا۔ بڑھاپے میں اس نے یہ سب کچھ چھوڑ دیا اور اپنی باقی زندگی فکر اور تدریس میں صرف کردی۔

کنفوشئس کی تعلیمات چینی طرزِ زندگی کی اساس بن گئیں کیونکہ ان میں بتایا گیا تھا کہ لوگ ایک دوسرے سے کس طرح پیش آئیں۔ ممکن ہے یہ قوانین ہماری نظر میں پیچیدہ ہوں لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس دَور میں جاگیرداروں کی بڑی عزّت تھی۔ ان کے بہت سے غلام تھے اور کسانوں کو بھی ان کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ خاندانی یک جہتی کا یہ عالم تھا کہ ایک ہی چھت کے نیچے کئی نسلیں گزر جاتی تھیں۔ کنفوشیس کی تعلیمات کی کامیابی کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ دنیا کے کسی ملک میں اتنا اتفاق اور کسی ملک کے باشندوں میں اتنی یک جہتی نہیں رہی جتنی چین میں رہی ہے۔

کنفوشیس نے نہایت سادگی کے ساتھ یہ بتایا کہ ایک دیہاتی کو کس طرح اپنے آقا کی عزت کرنی چاہیے اور آقا کو اس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، زمیندار کو اپنے لگان دار کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے اور لگان دار کو زمیندار کے

ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے، بیوی کو شوہر کا اور شوہر کو بیوی کا کتنا خیال ہونا چاہیے، بیٹے کو اپنے والدین کا کس طرح احترام کرنا چاہیے اور والدین کو اپنے بیٹے کے احساسات و خواہشات کا احترام وپاس ہونا چاہیے۔ اسی طرح اُس نے بہت سے دوسرے رشتوں پر روشنی ڈالی۔ اگرچہ چین میں سول سروس امتحانات کا سلسلہ غالباً ہان[1] خاندان کی حکومت سے پہلے شروع نہیں ہوا تاہم کنفوشیس نے ان امتحانات کی داغ بیل ڈالی دی تھی۔ بعد میں یہ امتحانات اسی فلسفی کے اقوال اور تحریروں پر منظم کیے گئے۔

چین میں بزرگوں کی پرستش کا رواج کنفوشیس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اس نے اِس نظریے کی حمایت کی کیونکہ وہ ہر فرد کو ذمّہ داری کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ اُس نے بزرگوں کی پرستش کے لیے چند قواعد وضع کیے۔ لوگوں کو یہ سمجھایا گیا کہ مرحوم بزرگ دوسرے عالم میں پہنچ کر بھی ضروریاتِ زندگی کے خواہاں رہتے ہیں۔ زندوں کا فرض ہے کہ اُن کو پورا کریں اور اپنے بزرگوں کو آرام بخشیں۔ اِس تخیّل نے چینیوں میں باہمی اتفاق و محبّت کی بنیاد استوار کی اور اُسے قائم رکھا۔

تقریباً اسی زمانے میں چین میں اور بھی کئی مفکّر اُبھرے۔ مثلاً مینکس[2] اور لاؤزے[3]۔ یہ زمانہ تھا ہی عظیم مفکّرین کا۔ ہندوستان میں گوتم بُدھ نے ایک نیا مذہب شروع کیا جو ہندوستان سے تو رخصت ہو گیا لیکن چین میں اس قدر لوگ اُس کے گرویدہ ہوئے کہ اس سے پہلے کسی دوسرے کے نہیں ہوئے تھے۔ اِسی عہد میں یونانی فلسفی اور عبرانی رہنما پیدا ہوئے۔ چین کو پھر کبھی اتنی ذہنی آزادی میسّر نہیں آئی اور نہ ہی ایسے تخلیقی خیالات دوبارہ پیدا ہو سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چو خاندان کے دورِ حکومت میں چین پر جاگیردارانہ نظام

---

[1] Han [2] Menicus [3] Laotze

مسلّط رہا۔ ساری زمین چند جاگیرداروں کی ملکیت تھی جو بادشاہ کو مالگزاری ادا کرتے تھے۔ پانچویں صدی کے قریب یہ نظام ٹوٹنے لگا۔ جاگیرداروں میں نا اتفاقی پیدا ہو گئی اور خانہ جنگیوں نے انھیں کمزور کر دیا۔ حتّٰی کہ یہاں چن حکومت قائم ہوئی اور شی ہوانگ ڈی نامی حکمران تخت پر متمکّن ہُوا جس نے دیوارِ چین تعمیر کی۔

شی ہوانگ ڈی نے صرف دیواریں ہی تعمیر نہیں کرائیں بلکہ اس نے قومی تعمیر کی طرف بھی توجّہ دی۔ وہی سب سے پہلے شہنشاہ کہلایا۔ اس کا پایۂ تخت سِین یانگ[1] تھا، جو سیان فو کے قریب واقع تھا۔ اُس نے کسانوں کو ان کی زمینوں کا مالک بنا دیا اور آب پاشی کا انتظام کر کے کھیتوں میں نئی جان ڈالی۔ اس نے سڑکوں کی مرمّت کرائی اور حمل و نقل کے لیے نئی نہریں کھدوائیں۔ اس نے ناپوں اور اوزان میں یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش بھی کی اور تمام آلات کو بہتر بنایا۔ وہ کنفوشیس کا حامی نہیں تھا۔ اُس کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ اُس نے وہ تمام کتابیں جلوادیں جو اس کے فلسفے سے مختلف تھیں۔ بایں ہمہ وہ ایک محتاط شخص تھا اور اس نے اِن کتابوں کو جلوانے سے پہلے اِن کی نقول محفوظ کر لیں۔ کتابیں جلوانے کا یہ عمل اِس عظیم رہنما کے خلاف آج تک یادگار بنا ہُوا ہے۔ غالبًا اسی کے دورِ حکومت میں اُس کے ایک فوجی کمانڈر مینگ ٹین[2] نے لکھنے کے لیے بالوں کا برش ایجاد کیا اور کتابیں لکھنے کے لیے بانس کی بجائے ریشمی کپڑے کا انتخاب کیا۔

شی ہوانگ ڈی نے چین میں یک جہتی اور اتفاق پیدا کیا اور اس کی سرحدوں کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی فوجیں کوانگ ٹنگ نامی جنوبی صوبے تک بھیجیں۔ جہاں کینٹن واقع ہے۔ اس کے بعد وہ شمال مغرب کی طرف متوجّہ

---

[1] Hsien Yang   [2] Meng T'ien

ہُوا اور وہاں باغی قبائل کو دبایا۔ جب شمالی حملہ آوروں نے اُسے بہت زیادہ پریشان کیا تو اس نے ان دیواروں کو جوڑ کر چین کی عظیم دیوار قائم کی ، جو مختلف بادشاہوں نے بنوائی تھیں۔ اس دیوار اور دوسرے حفاظتی اقدامات کے لیے اُسے روپے کی ضرورت پڑی جو اس نے کئی مختلف طریقوں سے حاصل کیا۔ مثلاً ٹیکس لگا کر اور نمک اور لوہے پر حکومت کی اجارہ داری قائم کر کے۔

اگرچہ شی ہوانگ ٹی رموزِ مملکت سے اچھی طرح واقف تھا، تاہم اپنے مذہب کے اعتبار سے یہ شخص بڑا توہم پرست تھا۔ اس نے بہت سا وقت ایک ایسی دوا کی تلاش پر ضائع کر دیا جو انسانوں کو لافانی بنا دے۔ اس تلاش کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے اِس دوا کے متعلق یہ سُنا کہ وہ بحیرۂ زرد کے اُس پار سے مل سکتی ہے۔ لہٰذا اُس نے قیمت کے طور پر اچھے خاندانوں کے کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس سمت میں روانہ کیے۔ کہا جاتا ہے کہ یہی لوگ سب سے پہلے جاپان پہنچے اور انھوں نے وہاں ایک نوآبادی قائم کی۔

شی ہوانگ ٹی اپنے پایۂ تخت سے دورے پر باہر نکلا ہُوا تھا کہ اجل نے آلیا۔ اس کے وزیر اعظم لائی سُو[1] نے اس خوف سے کہ بادشاہ کے مرنے کی خبر سے بغاوت نہ پھیل جائے ، اس خبر کو دبائے رکھا کہ اور اُس کی لاش کو لے کر پایۂ تخت واپس آیا۔

لائی سُو نے بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے کو تخت نشین کرنے کی بجائے دھوکے سے دوسرے بیٹے کو بادشاہ بنا دیا۔ نئے بادشاہ نے اپنے باپ کا شاندار مقبرہ تعمیر کرایا۔ سَو سال بعد سسو ما چائن[2] نامی ایک عظیم تاریخ داں نے اِس

---

[1] Li Ssu

[2] Ssu-ma-Ch'ien

مقبرے کو ایک کھوکھلے پہاڑ سے تشبیہہ دی جس میں آسمانوں کی تصاویر موجود تھیں، پوری سلطنت کا نقشہ تھا اور ایسی حیرت انگیز مشینیں نصب تھیں کہ اگر کوئی قریب آتا، تو وہ اس پر خود بخود تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دیتیں۔ تاریخ دان کہتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ مقبرہ تعمیر کیا تھا، اُنھیں اس کے اندر ہی دفن کر دیا گیا تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہ سب چیزیں کس طرح بنائی گئی تھیں۔ اس کے بعد سارے مقبرے کی مرمّت کی گئی تاکہ وہ بالکل نیا معلوم ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ قصّہ کہاں تک درست ہے، لیکن ایک بلند پہاڑی اب بھی موجود ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ شی ہوانگ ٹی اعظم کا مقبرہ ہے۔

چن خاندان کے بعد ۲۰۶ ق م میں ہان خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ اِس خاندان سے متعارف ہونے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اہلِ چین اہلِ مغرب سے ایک بات میں خاص طور پر مختلف ہیں۔ انھوں نے علماء اور دانا انسانوں کو جنرلوں اور سیاست دانوں پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ اس کے برعکس اہلِ مغرب نے فوجی رہنماؤں اور سیاست دانوں کو زیادہ عزّت بخشی ہے۔ اہلِ چین نے سپاہیانہ پیشے کو بہت کم اہمیّت دی اور یہ کہا کہ اگر کوئی حکومت اپنے عوام کے مفاد کا خیال نہیں رکھتی تو وہ بے کار ہے۔ چینیوں کی ایک قدیم کہاوت ہے "عوام قوم کی بنیاد ہیں۔ اگر بنیاد مضبوط ہے تو پوری قوم مضبوط ہے۔"

ہان خاندان کی بنیاد ایک معمولی آدمی لیو پانگ[1] نے ڈالی تھی۔ اُس کے ساتھ اُس جیسے چند دوست بھی تھے۔ سب نے مل کر ان لوگوں کا تختہ اُلٹ دیا جو لیڈر بننا چاہتے تھے اور چین کی تاریخ میں ایک عظیم عہد کا آغاز ہُوا، جو ۴۰۰ سال تک قائم رہا۔

اس خاندان کا عظیم ترین بادشاہ ووٹی[2] تھا جس نے پچاس سال حکومت کی۔ اُس

---

[1] Liu Pang

[2] WuTi

نے پُرانے اور نئے دشمن کو مغلوب کیا لیکن شمال مغرب میں ایک دشمن ہنوز باقی تھا۔ یہ ایک قبیلہ تھا جس کا نام سیونگ نو[1] تھا۔ شی ہوانگ ٹی اکثر ان کے خلاف نبرد آزما ہُوا تھا لیکن انھیں مکمل طور پر شکست نہیں دے سکا تھا۔ ووٹی نے یہ کام بہتر طور پر انجام دیا۔ سیونگ نو قبیلے کے لوگ یوچی[2] نامی ایک اور قوم کے ساتھ بھی لڑتے جھگڑتے رہتے تھے جو چینی نہیں تھے بلکہ انڈو یوروپین تھے اور ہندوستان کے شمال میں بکیٹریا نامی علاقے پر حکومت کرتے تھے۔ یہ لوگ مہم جُو تھے۔ انھوں نے ہندوستان پر حملہ کرکے وہاں ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ووٹی نے سیونگ نو قبیلے کے خلاف یوچی قوم کے ساتھ الحاق کرلیا۔

اس مقصد کے لیے ووٹی نے یوچی لوگوں کے پاس جو سفارتی جماعت بھیجی، اُس کا سربراہ چانگ چائن[3] کو مقرر کیا۔ یہ شخص چین کی تاریخ میں بہت مشہور ہے اور اس سے بہت سی روایات منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ ۱۳۸ ق م میں اِس کام پر روانہ ہُوا لیکن سیونگ نو قبیلے نے اُسے پکڑ لیا اور دس سال قید رکھا۔ چانگ قید سے بھاگ نکلا اور بکیٹریا پہنچ کر ایک سال تک وہاں رہا۔ بکیٹریا کے لوگوں نے چانگ چائن کے مجوّزہ الحاق میں کوئی دلچسپی نہ لی۔

چانگ چائن کو بکیٹریا میں کچھ دل چسپ چیزیں ملیں مثلاً بانس اور کپڑا جن کے متعلق اُسے بتایا گیا کہ یہ چیزیں وہاں چین کے صوبے ینان سے پہنچی تھیں۔ وہاں سے وہ سرحد پار کرکے ہندوستان پہنچیں۔ اس طرح چانگ چائن کو ہندوستان اور چین کے درمیان برما کی طرف سے ایک راہ کھولنے کا خیال پیدا ہُوا تھا لیکن یہ خواب زمانۂ حال میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

چانگ چائن نے مغرب کی طرف بھی دورہ کیا، جہاں اس نے النافا اور انگو۔

---

[1] Hsiung Nu [2] Yuch Chi [3] Chang Ch'ien

دیکھے۔ وہ یہ چیزیں چین لایا۔ ووٹی نے چانگ چائن کی تقلید کی۔ اس نے چین کا اثر فرغنہ اور طارم بیسن تک پہنچایا۔ یہ علاقے برما کے شمال میں اور چین سے بہت دور واقع تھے۔ اُن سے خراج طلب کیا گیا۔ اُس کے دورِ حکومت میں دس سے زیادہ سفارت خانے چین میں قائم ہوئے۔ ان فتوحات سے چین ان ممالک سے متعارف ہوا جہاں یورپ نے اپنی چوکیاں بنائی تھیں۔ ان ممالک پر سکندر اعظم نے صرف دو صدی قبل حملہ کیا تھا۔

ووٹی نے شمال مشرقی علاقے پر بھی حملہ کیا، جو اب کوریا کہلاتا ہے اور وہاں اپنی نوآبادی قائم کی۔ اہلِ جاپان کوریا کے لیے 'چوزن'[1] کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ اُسی وقت سے چلا آتا ہے جب اُس کا نام 'چاؤ ہزین'[2] تھا۔ اہلِ چین کا دعویٰ ہے کہ اسی زمانے میں چین کا ثقافتی اثر ان جزیروں تک پہنچا جو بعد میں جاپان کہلائے۔

ووٹی نے جنوبی قبائل کو بھی مغلوب کیا جنھیں شی ہوانگ ٹی نے زیر کیا تھا لیکن وہ بدنظمی کے دور کا فائدہ اٹھا کر خود مختار ہو گئے تھے۔ کوانگسی، کوانگ تنگ، انڈو چین کا کچھ حصّہ، کوئیچو اور یونان نیز ہینان نامی خوب صورت جزیرہ سب کے سب ہان شہنشاہ کے زیرنگیں ہو گئے۔ اب چینی سلطنت تقریباً اتنی ہی وسیع ہو گئی تھی جتنی جمہوریۂ روم دوسری کارتھیجی جنگ کے وقت تھی۔

ہان خاندان کے فرمانروا لوگوں کی ذاتی صفات کو اہمیت دیتے تھے۔ نہ صرف ووٹی بلکہ دوسرے رہنماؤں نے بھی اس چیز پر زور دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چین میں یہ نظام اب سے اکیس صدی قبل شروع ہو گیا تھا اور دو طرح عمل کرتا تھا۔ اوّل ان لوگوں سے کچھ روپیہ لے لیا جاتا تھا جن کے پاس بہت زیادہ ہوتا تھا۔ دوسرے اگر کوئی لڑکا ذہین

---

[1] Chosen [2] Ch'aohsien

اور ترقی پسند ہوتا تھا تو اُسے اُٹھنے کا موقع دیا جاتا تھا۔

ووٹی جاگیردارانہ نظام کا دشمن تھا۔ اس نے ایک قانون وضع کیا جس نے اس رسم کی مخالفت کی کہ کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی تمام جائداد اور اثاثہ اُس کے بڑے بیٹے کو ملنا چاہیے۔ ووٹی نے کہا کہ اس کا ترکہ سب بیٹوں میں برابر برابر تقسیم ہونا چاہیے۔ خاندان بڑے بڑے تھے اس لیے جاگیریں جلد ہی ٹوٹ کر پارہ پارہ ہوگئیں، نہ کوئی بڑا رہا نہ کوئی چھوٹا۔

ملک کے تمام نوجوانوں کو ترقی کے ایک جیسے مواقع دینے کے لیے مقابلے کے امتحانات ہوتے تھے جن میں ہر نوجوان شریک ہو سکتا تھا، خواہ وہ کیسے ہی گمنام دیہات یا خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ تمام دیہات بڑے فخر سے اپنے سپوتوں کو ان امتحانات کے لیے تیار کرتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا ایک امتحان میں کامیاب ہو جاتا تھا اور دوسرے امتحان کی تیاری کرتا تھا تو سارا گاؤں خوشی مناتا تھا۔ ان امتحانوں میں یادداشت جانچی جاتی تھی۔ نیز ادبیاتِ عالیہ اور کنفوشیس کی کتابوں سے سوالات پوچھے جاتے تھے۔ ان امتحانات کی دو خصوصیات تھیں۔ اوّل تو وہ سب کے لیے ترقی کے برابر مواقع فراہم کرتے تھے۔ دوسرے وہ قدیم فلسفیوں کی تعلیمات پر زور دیتے تھے اور انھیں چینی زندگی کی بنیاد قرار دیتے تھے۔ ان دونوں باتوں کا چینی طرزِ حیات اور تاریخ پر نمایاں اثر پڑا۔ کنفوشیس کی تعلیمات مذہب کا درجہ اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ چین اپنے قدیم فلسفیوں کے اقوال کو اس قدر اہمیت دیتے تھے!

ووٹی کے مرنے کے بعد وانگ مانگ[1] نے اس نظام کو جاری رکھا۔ اُس نے تمام زمینوں کو قومی ملکیت قرار دیا اور غلامی کا قلع قمع کیا جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے نظامِ زر کی از سرِ نو تنظیم کی اور شی ہوانگ ٹی کی قائم کردہ سرکاری اجارہ داری

---

[1] Wang Mang

کو جاری رکھا بلکہ اس فہرست میں کچھ اور چیزیں بھی شامل کیں۔ اس نے قیمتیں کم کیں اور سرکاری قرضوں کے لیے روپیہ پیدا کیا۔

چونکہ اس شخص کا تعلق غاصبوں کے خاندان سے تھا، اس لیے اہلِ چین اُسے اکثر غدّار کے نام سے یاد کرتے ہیں تاہم اُسے ادبیات سے گہرا لگاؤ تھا۔ وانگ مانگ نے قدیم کتابوں کے مطالعے پر زور دیا اور لوئی حسینؔ کی سرپرستی کی، جو چین کا اوّلین مصنّف سمجھا جاتا ہے۔ اس نے قدیم تصانیف کی پہلی فہرست مرتب کی۔ وانگ مانگ نے ہزاروں طلبا کے لیے اقامت گاہیں تعمیر کیں اور تعلیم کو پھیلانے کے لیے حتی المقدور سب کچھ کیا۔ اس نے اس مندر کی مرمّت کرائی جسے کنفوشیس مقدّس سمجھتا تھا اور اپنے ورثا میں سے ایک کو ایک لقب بھی عطا کیا۔

چین کی وسعت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ مغرب سے ملا جا رہا تھا۔ اُس کی تجارت کو بڑا فروغ حاصل ہُوا۔ دور دراز کے سوداگر ریشمی سڑک نامی شاہراہ سے وسطی ایشیا کو پار کرکے یہاں تک آتے تھے اور کانچ، ہاتھی دانت، سیپیاں اور اون نیز کتان کے عمدہ کپڑے فروخت کرکے یہاں سے ریشم، دارچینی، ریوند چینی اور کھالیں لے کر اپنے وطن واپس جاتے تھے۔ کچھ ریشم صدیوں بعد ان راستوں کے قریب پڑا ہُوا پایا گیا۔ ریگستان کی خشک ہوا نے اُسے خراب نہیں ہونے دیا۔ چین میں آڑو اور خوبانی پیدا ہوتے تھے۔ وہ روم میں بہت مقبول ہوئے۔

کچھ تاجر جنوبی سمندروں کی راہ سے بھی چین آتے تھے۔ کچھ برما کے دریاؤں سے گزر کر ینان کی پہاڑیوں کو پار کرکے یہاں آتے تھے۔ اس وقت جنوبی بندرگاہ کا نام ٹونگ کنگ تھا جو صدیوں بعد کینٹن کہلایا۔ تقریباً پہلی صدی میں مغربی تاجروں کو

Lui Hshin ؎

مون سون ہواؤں کی اہمیت کا احساس ہُوا کہ وہ ان کی مدد سے بحرِ ہند کو پار کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بحری تجارت کو فروغ حاصل ہُوا۔

ہان کے چینی باشندے رومن سلطنت کو ٹاچن[1] کہتے تھے۔ ۱۲۰ء میں جنوبی ریاستوں کے کچھ سفیر چند بازی گروں کو ساتھ لے کر آئے اور کہا کہ وہ سمندر کے مغرب میں واقع ٹاچن جیسے ایک ملک سے آئے ہیں۔ ۱۶۶ء میں ٹاچن کے سوداگر لویانگ میں آئے اور اپنے تئیں شاہ مارکس اوریلیس اینٹونینس کا نمائندہ ظاہر کیا۔ خواہ یہ سچ ہو یا جھوٹ، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہان کے لوگ رومن سلطنت سے واقف تھے۔ انھوں نے اس کے متعلق جو مندرجات چھوڑے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے وہ ملک اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

اس ابتدائی دَور میں یورپ کی بنی ہوئی اشیاء کے چین میں پہنچنے کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں تاہم بیرونی منگولیا کے مقبروں میں ایسی چیزیں ملی ہیں جو یونان، بابل اور اشور کی بنی معلوم ہوتی ہیں۔ جنوبی کوریا میں کھدائی سے ایسے ٹکڑے برآمد ہوئے ہیں جو رومن جام معلوم ہوتے ہیں۔

سوداگروں کی اس آمد و رفت، جمہوریت اور کنفوشیس کی تعلیمات کا چین پر گہرا اثر پڑا۔ لیکن اس سے بھی گہرا اثر بودھ تحریک نے ڈالا جو ہان خاندان کے دورِ حکومت میں ہندوستان سے چین پہنچی۔

گوتم بُدھ تقریباً ۵۶۳ء قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ ان کی پیدائش کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں جن میں سے کچھ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے متعلقہ روایات سے مشابہ ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ جس جگہ وہ پیدا ہوئے تھے،

---

[1] Ta Ch'in

وہاں ایک ستارہ ساکن ہوگیا۔ اس کے بعد چند معجزات، بارہ حواریوں اور دوسرے واقعات کا ذکر ملتا ہے جو دینِ عیسوی جیسے ہیں۔

گوتم ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئے تھے لیکن انھیں شاہی سے نفرت تھی۔ ان کے والد نے انھیں غم و اندوہ کے تمام مواقع سے بچانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ جب وہ باہر نکلتے تھے تو تمام سڑکیں صاف کر دی جاتی تھیں۔ کسی غریب یا بیمار شخص کو اُن کے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی لیکن یہ چیزیں گوتم بدھ کی نظر سے نہ بچ سکیں۔ ایک فقیر کو دیکھ کر انھیں یہ اندازہ ہُوا کہ دنیا میں بہت سے غریب بھی بستے ہیں۔ ایک بیمار کو دیکھ کر انھیں بیماری کا خیال آیا اور ایک جنازے کو دیکھ کر انھیں مَوت کا خیال آیا۔

ایک شب گوتم نے اپنے خوب صورت محل، بیوی اور بچّے کو خیر باد کہا اور سکون کی تلاش میں نکل کھڑے ہُوئے۔ انھوں نے ایک کے بعد دوسرا طریقہ آزمایا۔ آرام تج دیا، فاقے کیے اور دھیان بھی کیا لیکن منزلِ مطلوب نہ مل سکی۔ بالآخر بڑی ریاضت کے بعد انھیں نروان حاصل ہُوا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان اچھے اعمال اور اچھے خیالات سے سکونِ قلب حاصل کر سکتا ہے۔ بہت سے پیرو آہستہ آہستہ اُن کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان میں سے کچھ نے گوتم بدھ کے لیے مندر تعمیر کرنے چاہے اور کچھ نے مختلف طریقوں سے اُن کی یادگاریں قائم کرنے کی کوشش کی لیکن گوتم بدھ کی اِن چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کسی مورتی کے خواہاں نہیں تھے، کوئی ایسی چیز نہیں چاہتے تھے جو نظر آئے کیوں کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ سچائی دل اور دماغ میں محفوظ رہتی ہے۔

اُن کی تعلیمات کا اصل مقصد یہ تھا کہ ایک انسان دوسرے انسانوں اور جانداروں کے ساتھ محبت سے پیش آئے۔ وہ جبر و تشدّد کے حامی نہیں تھے۔ جب وہ بوڑھے

ہو گئے تھے تو ایک غریب لوہار نے اُنھیں ایک پیالے میں کچھ کھانا دیا۔ لوگ اب انھیں بُدھ یعنی معلّم کہنے لگے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اِس پیالے میں سڑا ہُوا گوشت ہے، پھر بھی انھوں نے کچھ نہیں کہا اور اُسے خاموشی سے کھا لیا۔ اُسے کھانے کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔ مرتے وقت انھوں نے اپنے معتقدین کو اپنے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی تلقین کی اور کہا کہ وہ بھی اُسی طرح زندگی کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کریں جس طرح انھوں نے سمجھا تھا۔

گوتم بدھ کے مرنے کے بعد اُن کی خواہش کے خلاف لوگوں نے اُن کی یاد میں بہت سے استوپ تعمیر کرائے اور ان کی پُوجا شروع کر دی اور چونکہ وہ اپنے سامنے اُنھیں دیکھنا چاہتے تھے، اس لیے بُدھ کی مورتیاں بھی بننے لگیں۔ ان کی تعلیمات پر بحث و تمحیص شروع ہو گئی اور ان کے پیرو کئی فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ کئی مکتبِ خیال پیدا ہُوئے۔ جو شخص اپنی تعلیمات میں سادگی اور صداقت قائم رکھنا چاہتا تھا اور بُت پرستی کے خلاف تھا، وہ ایک پیچیدہ مذہب کا مرکز بنا دیا گیا اور اس کی ہزاروں مورتیاں تیار ہو گئیں۔

عجیب بات ہے کہ جب بُدھ مت چین پہنچا، تو وہاں کے لوگوں کو وہ اچھا لگا۔ گوتم نے زندگی سے فرار کی کوشش کی تھی لیکن چینی لوگ زندگی سے محبت کرتے تھے اور زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے بزرگوں کی پرستش بھی اسی لیے کرتے تھے کہ خاندان میں یک جہتی برقرار رہے اور بزرگ خوش ہوں۔

چین غالباً ہان دورِ حکومت میں بُدھ مت سے متعارف ہُوا۔ اُس زمانے میں اِس مُلک کی سرحدیں شمال میں پھیل کر ہندوستان سے جا ملی تھیں، جہاں بُدھ مت کا چرچا تھا۔ دوسری اور تیسری صدی قبل مسیح میں اشوک اعظم ہندوستان کا بادشاہ اور اس مذہب کا زبردست پیرو تھا۔ اس نے گوتم بدھ کی تعلیمات پھیلانے کے لیے بہت سے مبلّغ

باہر بھیجے۔ مسیح ؑ سے دو صدی قبل یوچی قبیلے میں چینی سفیر کو اس مذہب کی خبر ہوئی۔ غالباً بکیٹریا اور فرغنہ میں آنے والے بہت سے دوسرے چینیوں نے بھی اِس مذہب کا چرچا سُنا اور اس طرح یہ مذہب چین پہنچا۔ ۱۹۰ھ میں ان ہُوائی[1] کے صوبے میں بُدھ کا ایک مندر تعمیر کیا گیا اور کچھ ہی عرصہ بعد چین میں بودھ جماعتیں نظر آنے لگیں۔ ہندوستان سے مختلف راستوں سے گذر کر بہت سے مبلغین بھی اس مذہب کا پرچار کرنے کے لیے چین میں وارد ہو چکے تھے۔

بدھ مت کے آنے کی وجہ سے ہان خاندان کی شان میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ آئندہ چند صدیوں میں یہ مذہب ہندوستان سے تو رخصت ہو گیا اور چین کا سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ اِس خاندان کے دورِ حکومت میں چین کی سرحدوں میں سب سے زیادہ توسیع ہوئی۔ چین میں رومن اثر تو آ ہی چکا تھا۔ ہندوستان کے شمال میں جو یونانی نو آبادیاں قائم ہو گئی تھیں، انھوں نے بھی اس ملک کو متاثر کیا۔ ریشمی سڑک نامی شاہراہ اور بحری راستوں کے ذریعے پہلے سے زیادہ تجارت ہونے لگی۔ کنفوشیس کا اثر بڑھا، ادبیات میں ترقی ہوئی اور چین دُنیا میں ایک ممتاز مُلک کی حیثیت سے سامنے آیا۔ یہ ایک عظیم سلطنت تھی لیکن اس کی اقدار جمہوری تھیں۔ جاگیرداروں کا قلع قمع کیا جا چکا تھا اور تمام اچھے عہدوں کے لیے مقابلے[2] کے امتحانات منعقد ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ چین آج بھی اپنے آپ کو فخر سے ہان جن[2] یعنی ہان کے آدمی کہتے ہیں۔

---

[1] Anhwei
[2] Hanjen

چوتھا باب

عظیم سوئی[1] اور ٹانگ[2] خاندان

۲۲۰ء میں ہان خاندان زوال پذیر ہو گیا اور اس کے بعد ساڑھے تین سو سال تک ملک میں بدامنی کا دور دورہ رہا۔ ایک کے بعد دوسرا لیڈر برسرِ اقتدار آتا رہا، لیکن کسی کو قیام نصیب نہیں ہُوا۔ مغرب میں بھی اِسی قسم کے واقعات رونما ہو رہے تھے۔ روم کی زبردست سلطنت پارہ پارہ ہو گئی اور پھر کبھی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل نہ کر سکی۔ یہ زمانہ یورپی تاریخ کا تاریک دَور کہلاتا ہے۔ چین میں اتنی زبردست تبدیلیاں پیدا نہیں ہوئی تھیں، نہ ہی اِس ملک نے اُس زمانے میں کوئی خاص قوّت حاصل کی تھی۔ شاید اس وقت بھی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک کا مستقبل اس کے حال سے زیادہ تابناک ہے۔

چین کا ایک نہایت مشہور ناول "تین سلطنتوں کا رومان[3]" ہے۔ اسے سولھویں صدی میں آخری شکل دی گئی تھی۔ اس میں بدنظمی کے اُس دَور کی کچھ تاریخ دی گئی ہے، جب تین مختلف ریاستیں ظہور میں آئیں۔ چین کے تمام اسکولوں میں یہ کتاب پڑھائی جاتی ہے اور ہر طالب علم اس دَور کی تاریخ نیز بہت سے دوسرے واقعات سے واقف ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے بہادروں اور اُن کے کارناموں کا ذکر ہے۔ اُن میں سے ایک جنگ کا دیوتا بن گیا۔ سپاہیوں کے محافظ کی حیثیت سے اب بھی اُس

---

[1] Sui [2] T'ang [3] The Remance of the three Kingdoms

کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس زمانے میں ہر شخص دلیری، شان و شوکت اور عظیم کارنامے سرانجام دینے کی فکر میں رہتا تھا۔

شمال کی اس بدنظمی کا آنے والے دور پر نمایاں اثر پڑا۔ بہت سے چینی باشندے شمال سے جنوب کی طرف منتقل ہو گئے اور دریائے یانگ سی کی وادی میں آباد ہو گئے۔ یہ وادی اس سے قبل سلطنتِ چین کا مرکز نہیں تھی بلکہ محض حاشیہ بردار تھی۔ ایک اور دل چسپ بات یہ تھی کہ چین کے حملہ آوروں نے یہاں کی تہذیب کو تباہ نہیں کیا جیسا کہ یورپ میں ہوا بلکہ انھوں نے اس میں چار چاند لگائے۔ اس حقیقت پر مزید روشنی نہیں ڈالی جا سکتی لیکن چین میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔

اگرچہ ملک میں خانہ جنگیوں کا سلسلہ جاری رہا، پھر بھی یہاں بڑے اچھے ادیب پیدا ہوئے۔ کنفوشیس اُن میں سے ایک تھا۔ ملک نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی۔ اس زمانے میں شاعری کو عروج حاصل ہوا، کیونکہ کچھ شعراء نے اس ہنگامے سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنے فن میں محو ہو گئے۔ بہت سے کتب خانے قائم ہوئے۔ ان میں سے کچھ بعد میں تباہ بھی ہو گئے، تاہم قدیم ادبی شہ پارے محفوظ رہے۔

جاپان نے چین کا اثر زیادہ قبول کیا۔ چین کے زیرِ اثر جزیرہ نما ئے کوریا میں ایک ریاست قائم ہوئی اور اس طرح چینی ثقافت نیز بدھ مت جاپان پہنچا، جہاں چینی طرزِ تحریر رائج ہوا اور لوگوں نے کپڑا بُننے کا فن سیکھا۔ جاپان کو چین کی ایک ذیلی ریاست سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے دو حکمران خاندان جاپانی فرمانرواؤں کو خطابات و اعزازات عطا کرتے رہے۔

چین میں کنفوشیس کی تعلیمات پر زور دیا جاتا رہا لیکن ساتھ ساتھ بدھ مت نے بھی حیرت انگیز ترقی کی۔ ۳۹۹ء میں فاہیان نامی ایک چینی راہب بدھ مت کی مقدس کتابوں کی نقول حاصل کرنے کے لیے ہندوستان آیا۔ اس نے شمال کی طرف سے

ریگستان گوبی پار کیا اور بڑے بلند و خطرناک درّوں سے گذرا۔ وہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت سے بہت متاثر ہُوا اور اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد سیلون کی راہ وطن واپس آیا۔ سیلون میں بھی اس نے بدھ مت کا اثر بڑھتے دیکھا۔ پندرہ سال کی سیاحت اور بہت سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ راہب وطن واپس پہنچا۔ ایک مرتبہ جہاز غرق ہونے سے وہ موت کے مُنہ سے بال بال بچا۔

اِس طرح چین میں صرف مہاتما بدھ کی تعلیمات ہی نہیں پہنچیں بلکہ اُن کی مورتیاں بنانے کا آرٹ بھی شمالی ہندوستان سے یہاں آیا، جو ہندوستان کے شمال میں گندھار نامی علاقے میں رائج تھا۔ یہاں یونانی اثر غالب تھا۔ یہ مورتیاں یا مجسّمے اس لحاظ سے دلچسپ ہیں کہ وہ اپنے بنانے والوں کی عکّاسی کرتے ہیں۔ مہاتما بدھ یونانی چغہ پہنے دکھائے گئے ہیں، ان کے سر پر چھوٹی سی یونانی ٹوپی ہے اور بالوں میں گھونگھر پڑے ہیں۔ بعد کے مجسّموں میں یہ ٹوپی ذرا اُبھری ہوئی دکھائی گئی ہے اور اس کے بیچ میں ایک ٹونا ہے۔ بالوں کے گھونگھرنے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی شکل اختیار کرلی ہے جو ان کے پورے سر پر اُبھرے نظر آتے ہیں۔ مہاتما بدھ کے یہ یونانی مجسّمے ریشمی سڑک کے ساتھ ساتھ ٹن ہونگ کے غاروں میں اور لویانگ کے قریب آج بھی موجود ہیں۔

ہان خاندان کے زوال کے بعد چین میں جو بدنظمی پھیلی رہی، اُس سے وہاں کی تہذیب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس نے آنے والے درخشندہ دَور کی بنیادیں استوار کیں۔ سوئی اور سانگ خاندانوں کے دورِ حکومت کے بعد چین کو پھر کبھی ایسے انتشار سے واسطہ نہیں پڑا۔ وہ بدترین زمانہ دیکھ چکا تھا۔

سوئی خاندان کا بانی وین ٹی[لے] تھا۔ اس نے حکومت کی از سرِنو تنظیم کی اور ملک کے

لے Wen Ti

شمالی حصّے کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لیے نہریں کھدوائیں۔ ان نہروں نے دریائے زرد کو دریائے یانگ سٹی سے ملا دیا۔ ٹونگ کنگ اور انام پر مکمل اقتدار حاصل کرنے کے لیے وین ٹی نے جنوب کا رُخ کیا۔ یہ کام اس کے بیٹے نے سرانجام دیا جس نے دیوارِ چین کو مضبوط بنایا اور ترکی قبیلوں کی قوّت کو توڑا۔

جیسا کہ ان موقعوں پر ہوتا ہے، کچھ لوگوں نے وین ٹی کے خلاف بغاوت بھی کی۔ رفتہ رفتہ سوئی خاندان کو زوال ہُوا اور چین کی تاریخ میں روشن ترین عہد کا آغاز ہُوا۔ یہ سانگ فرمانرواؤں کا دَور تھا جو ۶۱۸ء میں شروع ہُوا۔

اس سے قبل کئی ممتاز رہنما پیدا ہوئے جن میں ووہو[1] نامی ایک عورت بھی تھی۔ اس میں تنظیم کی صلاحیت بدرجۂ اُتم موجود تھی۔ اس نے چین کی سرحدیں مضبوط کیں اور ملک کے اندر امن و امان قائم رکھا۔ اُسے بدھ مت سے عقیدت تھی اور اسی نے مجسّمہ سازی کو بامِ عروج تک پہنچایا۔ اس نے اسّی سال کی عُمر تک حکومت کی۔ اس کے بعد سانگ خاندان کو ایک اور عظیم رہنما ملا جس کا نام منگ ہوانگ[2] تھا۔

منگ ہوانگ نے ۷۱۲ء سے ۷۵۶ء تک حکومت کی۔ اس دَور میں چین کی سرحدیں شمال اور مغرب میں خوب پھیلیں حتٰی کہ دو ترکی قبائل بھی خوشی خوشی اس کی پناہ میں آ گئے۔ دریائے طارم کے بیسن میں رہنے والے کچھ قبائل نے بھی عربوں سے ڈر کر چین سے الحاق قائم کر لیا۔ منگ ہوانگ نے کوریا کے ایک جنرل کی سرکردگی میں کچھ فوج ہندوستان کے شمال میں کوہ ہندوکش کے علاقے میں بھیجی تاکہ عربوں اور تبتیوں کی متحدہ قوّت کو توڑا جا سکے۔ اس طرح چین کا اثر دریائے سندھ کے بالائی حصّے تک پہنچ گیا۔

---

[1] Wu Hou

[2] Ming Huang

دوسرے ملکوں کے ساتھ میل جول کا یہ نتیجہ ہُوا کہ چین میں نئی چیزیں آئیں۔ تجارت کو پہلے سے زیادہ فروغ حاصل ہُوا اور غیر ملکی سوداگر اس ملک میں وارد ہوئے۔ چانگان[1] دارالخلافہ تھا جہاں دُنیا کے تمام ملک کے باشندے رہتے تھے، تجارت عروج پر تھی اور لوگ خوش حال۔ بازاروں میں رونق تھی اور دنیا بھر کے لوگ اپنی اپنی زبان میں گفتگو کرتے سُنے جاتے تھے۔ بہت سے سوداگر جنوبی بحری راستوں سے چین میں داخل ہوتے تھے۔ ٹونگ کنگ کی اہمیّت گر گئی تھی۔ اس کی جگہ کینٹن ملک کی خاص بندرگاہ بن گیا تھا۔ ایران، عرب اور ہندوستان کے تاجر کاروبار کے سلسلے میں چین آتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ چین کا مال بغداد کے بازاروں تک پہنچتا تھا۔ کینٹن میں عیسائی، یہودی، مسلمان اور ایرانی سب کے سب یک جا نظر آتے تھے۔ مغرب کے تاجر دریائے یانگ ٹسی کے دہانے سے داخل ہوکر یانگ چو تک پہنچتے تھے اور کاروبار کرتے تھے۔

دونوں طرف سے کم حجم لیکن زیادہ مالیت کا مال اسباب آتا جاتا تھا۔ مغرب کے تاجر اپنے ساتھ ہاتھی دانت، لوبان، تانبا، سیپیاں اور گینڈے کے سینگ لاتے تھے۔ غالباً عرب سوداگر چینیوں کے ہاتھوں حبشی غلام بھی فروخت کرتے تھے۔ چین سے ریشم، گرم مسالے اور چینی مٹّی باہر بھیجی جاتی تھی لیکن چینی سوداگر خود کم تعداد میں باہر نکلتے تھے۔ ملک میں ابھی تک یہ احساس موجود تھا کہ چین وسطی سلطنت ہے اور دنیا کا کوئی دوسرا ملک اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

یہ بات صرف ایک اعتبار سے غلط تھی۔ فلسفے کی خاطر اہلِ چین دُور دُور جانے اور تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار تھے۔ جس طرح فاہیان چوتھی صدی

---

[1] Ch'angan

میں ہندوستان گیا تھا، اُسی طرح اب کچھ اور لوگ بھی بُدھ مت کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر جانا چاہتے تھے۔ سانگ خاندان کا ایک مشہور شخص ہوان سانگ ہندوستان گیا۔ اُس نے خشکی کا دُور دراز راستہ طے کیا اور سولہ سال کے بعد بُدھ مت کی بہت سی کتابیں لے کر واپس لوٹا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے عیسائی مذہب کی کتابوں کے مقابلے میں پچیس گُنا زیادہ کتابوں کے تراجم کیے۔ اُس نے بیس سال اِس کام میں صرف کیے۔ اِن تمام باتوں کا یہ نتیجہ ہُوا کہ چین میں بُدھ مت تیزی سے پھیلنے لگا۔

مختلف ثقافتوں کے باہمی اختلاط اور تاجروں نیز علماء کی آمدورفت سے چین نے بہت سی نئی چیزیں سیکھیں۔ یہاں کے باشندوں نے انگور سے شراب بنانا سیکھا۔ ہندوستان سے نیشکر سے شکر بنانے کی ترکیب آئی۔ اسی طرح پالک، لہسن اور کئی طرح کی تلہن یہاں آئی۔ اسی زمانے میں مٹر کی کاشت کا رواج شروع ہُوا۔ ہندوستانیوں نے اہلِ چین کو بصری عدسے بنانا سکھایا۔

منگ ہوانگ نے تمام فنون کی ہمت افزائی کی۔ اس نے چانگان[۱] میں ہان لن یوان[۲] یعنی اسکول قائم کیا جس نے اتنی ترقی کی کہ ہر چینی عالم اُس میں داخل ہونا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ وہ شاعروں اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اُس نے موسیقی کا بھی ایک اسکول قائم کیا۔

سانگ دورِ حکومت میں چین میں دو عظیم شعراء پیدا ہوئے، ان کے نام تھے لی پو[۳] اور ٹو فو[۴]

لی پو غالباً مغربی چین میں پیدا ہُوا تھا۔ اُس نے اپنی جوانی سرخوشی میں بسر کی۔ وہ شراب کا رسیا تھا۔ اپنی عُمر کا درمیانی حِصّہ اُس نے دارالخلافے میں گذارا۔

---

[۱] Ch'angan [۲] Han Lin Yuan [۳] Li Po [۴] Tu Fu

جہاں وہ بادشاہ کی محبوبہ کی شان میں قصیدے پڑھتا تھا۔ اس حسینہ کا نام یانگ کوئی فی تھا۔ یہ شاعر مختلف سراؤں میں آتا جاتا، شراب پیتا اور شعر کہتا تھا۔ بعض اوقات اُسے عالمِ مدہوشی میں گھر لایا جاتا تھا لیکن پھر بھی اُسے عمدہ عمدہ نظمیں کہنے کا ہوش رہتا تھا۔ بالآخر یانگ کوئی فی اُس سے خفا ہو گئی اور اسے جلا وطن کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس شخص کی موت شراب سے ہی ہوئی۔ چاندنی رات میں وہ ایک جھیل پر کشتی میں بیٹھا سیر کر رہا تھا کہ یکایک جوش کے عالم میں اُس نے چاند کے عکس سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کی۔ غالباً یہ قصّہ درست نہیں لیکن اُس جیسے شخص سے کچھ بعید بھی نہیں۔

اس کی نظموں میں غضب کی روانی ہے کیونکہ وہ تیزی سے لکھتا تھا۔ اُسے فطرت، پہاڑوں، چشموں اور درختوں سے محبت تھی۔ اُس سے قبل کی چینی شاعری میں یہ بات نہیں کیونکہ وہ چند قواعد کی پابند ہے۔ مجموعی طور پر لی پو کی زندگی سخت اور الم ناک تھی۔ اس نے شاعری اور شراب میں پناہ لی اور شاید اسی وجہ سے اُس کے قلم سے اچھے شعر نکلے۔

ٹوفو نے راہِ فرار اختیار نہیں کی۔ وہ محنتی شخص تھا، اس نے امتحاناتِ مقابلہ کی تیاری کی، وہ بلند ترین علمی اعزازات حاصل کرنے کا خواہش مند تھا لیکن وہ فیل ہو گیا اور کچھ عرصہ اُسے اپنی ناکامی کا شدید احساس بھی رہا۔ منگ ہوانگ اُسے پسند کرتا تھا۔ اُس نے اُسے اپنے دربار میں مدعو کیا۔ منگ ہوانگ کے زمانے میں اُسے ہر طرح کا آرام حاصل رہا لیکن اس کے جانشین نے اُسے بے عزّت کر کے جلا وطن کر دیا۔ یہ زمانہ ٹوفو پر بڑی عُسرت کا گزرا۔ اس کے کچھ بچے فاقے کرتے کرتے مر گئے۔

ٹوفو اور لی پو میں بُعد المشرقین تھا۔ ٹوفو نے جو کچھ لکھا، بڑی احتیاط اور غور کے ساتھ لکھا۔ اُس کی نظموں میں غم کا عنصر غالب ہے۔ اُسے اپنی شاعری میں

پناہ نہیں مل سکی بلکہ اُس کے اشعار اُس کے ترجمان بنے۔

سانگ دورِ حکومت میں فنِ مجسّمہ سازی بھی بامِ عروج پر پہنچا۔ شمال مغرب میں بدھ آرٹ پر یونانیوں کا اثر پڑا تھا۔ اس کا تعلّق پینٹنگ سے بھی تھا۔ اس زمانے میں عظیم مندر تعمیر ہوئے اور انھیں ہزاروں تصویروں اور مجسّموں سے سجایا گیا جو بدھ مت کی روایات و معتقدات کی ترجمانی کرتے تھے۔ ہان عہد کے لوگوں نے جانوروں اور انسانوں کی جیتی جاگتی مورتیاں تیار کی تھیں۔ اب ان میں ایک خوبی کا اضافہ کیا گیا۔ دنیا کے بعض حسین ترین مجسّمے اسی دَور سے تعلّق رکھتے ہیں۔ ان عظیم فن کاروں کا کمال اُن یک سنگی زبردست مجسّموں اور تراشوں سے ظاہر ہے جو بعض دیواروں پر ابھی تک باقی ہیں۔

سانگ دورِ حکومت کا یہ کمال ان چھوٹی چھوٹی مورتیوں سے بھی ظاہر ہے جو مٹّی کی بنی ہوئی ہیں مثلاً کسی میں کوئی گھوڑ سوار دکھایا گیا ہے اور کسی میں کوئی رقصاں لڑکی۔ راہب، سوداگر، جنوبی سمندر کے کسی جزیرے کا باشندہ۔ سب کی جیتی جاگتی تصویریں موجود ہیں۔ ان مورتیوں سے ہمیں ان غیر ملکیوں کی صورت شکل، لباس اور معاشرت کا اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت چین میں آباد تھے۔ ان کی ہر چیز چینیوں سے مختلف تھی۔

مٹّی سے ایک اور آرٹ پیدا ہُوا۔ یہ تھی چینی مٹّی جو چین کی طرف سے ساری دنیا کے لیے ایک نایاب تحفہ ثابت ہوئی۔ اس آرٹ کی ابتدا یہاں سے ہوئی اور بعد میں وہ درجۂ کمال تک پہنچا۔

شاعری کی طرح پینٹنگ کو بھی بڑا عروج حاصل ہُوا۔ لوگوں نے برش کی مدد سے تصویروں میں نئی روح پھُونکی اور انھیں نیا حُسن عطا کیا۔ چین کا عظیم ترین مصوّر و وٹاؤزو[1] منگ ہوانگ کے دربار میں موجود رہتا تھا۔ اُسے مناظر کی تصویرکشی کا شوق تھا۔ اہلِ چین اُس کے کمال کے متعلّق ایک قصّہ بیان کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے شہنشاہ

---

[1] Wo Tao Tzu

کے لیے ایک دیوار پر ایک منظر پیش کیا۔ وہ اور شہنشاہ دونوں کھڑے ہوئے اُسے دیکھ رہے تھے کہ مصوّر نے تالی بجائی۔ یکایک دیوار میں ایک دروازہ کھُلا۔ وہ اس میں داخل ہوگیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔

اسی عہد میں طباعت کا فن ایجاد ہُوا۔ چین کے کسی اور تحفے نے دُنیا کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا طباعت نے کیا ہے۔

طباعت سے بدھ مت کا گہرا تعلّق تھا۔ جب اس مذہب نے چین میں پھیلنا شروع کیا تو لوگ تعویذ گنڈے استعمال کرنے لگے جو مہاتما بدھ یا اُن کے پیروؤں یا بعض دیوتاؤں کی تصویروں کی شکل میں ہوتے تھے۔ ان تصاویر کی مانگ بڑھی تو لوگوں کو انھیں زیادہ تعداد میں تیار کرنے کی فکر ہوئی۔ اہلِ چین عرصۂ دراز سے مُہر سے واقف تھے۔ اگر دو آدمیوں کے درمیان کوئی معاملہ ہوتا تھا، تو وہ ایک لکڑی کو بیچ میں سے توڑ کر ایک ایک حِصّہ اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ اگر بعد میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو دونوں حِصّوں کو آپس میں جوڑ کر شہادت دے دی جاتی تھی۔ بعد میں اس فن کو ترقی ہوئی تو لوگوں نے کچّی مٹّی میں اپنے نام لکھنے شروع کیے، یہ تھیں اوّلیں مُہریں۔ جب برش تیار ہُوا تو روشنائی بھی ایجاد ہوگئی اور اس کی مدد سے ریشم یا کاغذ پر مُہریں ثبت کی جانے لگیں۔ اب لوگوں نے سوچا کیوں نہ اسی طریقے سے تعویذوں کی تعداد بڑھائی جائے، نام کی بجائے کسی مجسّمے کی مُہر بنائی جائے۔ ایسا ہی ہُوا اور ایک مُہر سے مہاتما بدھ کی ہزاروں تصویریں بننے لگیں۔ لیکن اگر ایک تصویر اس طرح کتنی ہی بار چھاپی جا سکتی تھی، تو دوسری تصویریں اور الفاظ بھی چھاپے جا سکتے تھے۔

چین میں صدیوں سے کتابوں کا رواج چلا آرہا تھا۔ قدیم ادبی شہ پارے کثرت سے موجود تھے۔ شاعری اور رومانی قِصّوں کہانیوں کی بھی کمی نہ تھی جو بڑی محنت سے بانس یا ریشم پر لکھے جاتے تھے یا پتھر پر کندہ کیے جاتے تھے۔ مہروں کے ذریعے

لوگوں کے ذہن میں بلاک پرنٹنگ کا خیال آیا۔

۱۹۰۷ء میں سر اورل سٹین کو ایک خفیہ کمرے میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی جس میں کچھ مسودات بھرے ہوئے تھے۔ اس کمرے کا سراغ ایک بودھ راہب نے سات سال پہلے لگایا تھا۔ یہ کوٹھری چین کے شمال مغرب میں قدیم ریشمی سڑک پر ٹن ہوانگ کے قریب ایک ہزار بودھوں والے غار میں ایک دیوار کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔ یہاں اُسے تقریباً ڈیڑھ ہزار مسوّدات میں ایک مسوّدہ ایسا ملا جو ہاتھ کا لکھا ہُوا نہیں تھا بلکہ چھپا ہُوا تھا۔ باقی سب ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ اس پر ۸۶۸ء پڑا ہُوا تھا۔ سٹین نے دنیا کی قدیم ترین طبع شدہ کتاب دریافت کر لی تھی۔

۸۶۸ء میں چین پر سانگ خاندان کی حکومت تھی جو تین سَو سال تک قائم رہی اور ۹۰۷ء میں ختم ہوئی۔ اِن تین سَو سال میں چین میں اتنی ترقی ہوئی کہ اس کا شمار دنیا کی عظیم ترین اقوام میں ہونے لگا۔ ہر ملک کے لوگ یہاں کی خوب صورت چیزوں دولت اور علم سے بہرہ یاب ہونا چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ اس ملک سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ جاپان نے پہلے نارا اور بعد میں کیوٹو کو اپنا دارالخلافہ بناتے وقت چین کے چانگگان[1] کی نقل کرنے کی کوشش کی۔ کوریا کا انحصار چین کی ثقافت پر تھا۔

انڈوچین بھی شمال میں چین کی تہذیب سے سبق لیتا تھا۔ ترک، عرب، ایرانی اور یہودی سب کے سب شمال کی طرف سے یا سمندر کے راستے یہاں آئے۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھا۔ عرصۂ دراز تک لوگ یہ سمجھتے رہے کہ یہ فن عربوں نے ایجاد کیا تھا۔ چین سے ریشم، چینی مٹّی، مہاتما بدھ کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت مجسمے، مٹّی کی مورتیاں، بلند پہاڑوں، خوابیدہ وادیوں اور جگمگاتے آبشاروں کی تصویریں، گرم مسالے پھل، ریشم پر برش کے ذریعے لکھی ہوئی دلفریب نظمیں خشکی یا تری کے راستے مغربی

---

[1] Ch'angan

ملکوں تک پہنچیں اور ان لوگوں کو متاثر کیا جو سلطنتِ روم کی عظمت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔

اہلِ چین کی زندگی کنفوشیس کی تعلیمات سے زیادہ متاثر ہوئی۔ لوگوں نے اُن سے استقامت اور قوّت حاصل کی۔ اس کا پہلا سبق یہ تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جُل کر رہنا سیکھیں۔ اس وقت تک چین نے بیرونی دُنیا سے صرف بدھ مت کا اثر قبول کیا تھا۔ اس کے ساتھ تعمیر اور مجسّمہ سازی کے فنون یہاں آئے اور انھوں نے یہاں کے ادب اور فنِ تصویر کشی کو متاثر کیا۔ اِن سب باتوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ چین میں فنِ طباعت تیزی سے پھیلا۔ دنیا کی قدیم ترین مطبوعہ کتاب اس ملک اور یہاں کے مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔ لکھنے یا لکھانے والے نے یہ کتاب اپنے والدین سے منسوب کی ہے۔

پانچواں باب

قبلائی خان کا زرّیں عہد

سانگ دورِ حکومت کے خاتمے کے بعد چین میں جو ابتری پھیلی، اس کا کچھ اندازہ آپ کو اِس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ اہلِ چین پچاس سال کے ایک دَور کو پانچ خاندانوں کا دَور کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک نئے خاندان کی حکومت شروع ہوئی جس کا نام سنگ[1] ہے۔ وہ ۹۶۰ء سے ۱۲۷۹ء تک قائم رہی۔ بارھویں صدی میں اس خاندان کو زیادہ عروج حاصل ہُوا۔ اس وقت سانگ خاندان کو زوال پذیر ہوئے تقریبًا تین سَو سال گزر چکے تھے۔ ہانگ چو سنگ فرمانرواؤں کا دارالخلافہ قرار پایا۔ مارکو پولو نے یہاں کا دربار دیکھ کر کہا تھا کہ "بلاشبہ یہ (شہر) دنیا میں نفیس ترین ہے۔" اس وقت کے چین کی عظمت کا اندازہ ہمیں مارکو پولو کی تحریروں سے ہی ہوتا ہے۔ سنگ شہنشاہ جنوب میں حکومت کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد منگولوں نے چین پر حملہ کیا اور اُسے فتح کر لیا۔

مارکو پولو کے دو چچا نکولو[2] اور مافیو پولو[3] تھے، جو وینس کے رہنے والے تھے۔ وہ مارکو سے پہلے چین آئے تھے۔ جب وہ منگول دارالخلافے میں آئے، جو اُس وقت کمبالک کہلاتا تھا اور بعد میں پیپنگ کہلایا، تو اُسے یہاں بعض حیرت انگیز چیزیں ملیں۔ اُس وقت چنگیز خاں کا پوتا قبلائی خان حکومت کر رہا تھا اور ان چیزوں

---

[1] Sung [2] Nicolo [3] Maffeo Polo

سے بڑی دلچسپی تھی۔ جب یہ دونوں واپس ہونے لگے تو قبلائی خان نے ان کے ہاتھ پوپ کو ایک خط بھیجا اور اس سے سائنس اور دینیات کے سو معلّمین بھیجنے کی درخواست کی۔

اس اثنا میں منگول فوجیں جنوب کی طرف بڑھ رہی تھیں لیکن سنگ حکومت کو مغلوب کرنا آسان نہ تھا، جو دریائے یانگ سٹی کی زرخیز وادی میں مرکوز تھی۔ منگولوں کو پورے پانچ سال کے محاصرے کے بعد دو شہروں پر قبضہ حاصل ہوا، جو اُس وادی کا دروازہ تھے۔ اب منگول فوجیں ہانگ چو پر حملہ کر سکتی تھیں۔ کم سن حکمران گرفتار کر کے شمال کی جانب بھیج دیا گیا اور سنگ حکومت نے جنوب کی طرف بھاگ کر کنیٹن میں پناہ لی۔ دُشمن نے یہاں بھی اس کا تعاقب کیا۔ آخرکار اُس نے ایک بحری بیڑہ میں پناہ لی۔ کم سن حکمران نے شمال میں قید سے فرار ہونے کی کوشش کی اور مارا گیا۔ ہر طرف سے نا امید ہونے کے بعد سنگ کمانڈر، اُس کے خاندان اور ایک نئے کم سن حکمران نے سمندر میں کُود کر خودکشی کرلی۔ یہ ۱۲۷۹ء کی بات ہے۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ پُورے چین پر غیر ملکی فاتحین کا قبضہ ہو گیا۔ کُبلے خاں شمال اور جنوب دونوں حصّوں کا شہنشاہ بن گیا۔

پولو برادران کے علاوہ قبلائی خان دوسرے غیر ملکیوں کے ساتھ بھی اچھی طرح پیش آیا۔ اب باہر کے سوداگروں کو ملک میں آنے کی دعوت دی گئی۔ عرب سے بہت سے مسلمان یہاں آئے۔ انھوں نے چینی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ یہودی کائی فنگ[1] کے قریب آباد ہوئے اور وہاں انھوں نے ایک عبادت خانہ تعمیر کر لیا۔ جاپان سے بودھ راہب چین آئے، اُن کے بدلے چینی راہب جاپان گئے اور انھیں وہاں کی خانقاہوں میں اچھے منصب ملے۔ انڈوچین اور مشرقِ قریب کے ملکوں نے چین میں اپنے سفارت خانے

---

[1] K'aifeng

قائم کیے۔

اگرچہ چین باقی دنیا سے روشناس ہو رہا تھا تاہم خود اُس کے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو رہی تھی بلکہ جو لوگ باہر سے یہاں آئے وہ خود یہاں کی ثقافت سے متاثر ہُوئے اور یہاں جذب ہو کر رہ گئے۔ چین سے سینکڑوں زائرین ہندوستان جانے لگے اور منگولوں نے بہت سے چینیوں کو مختلف منصب عطا کر کے مغرب کی طرف بھیجا۔ ان میں سے ایک نے واپس آکر بغداد اور مصر کے حالات بھی بیان کیے لیکن چین پر کسی بات کا اثر نہیں ہُوا۔

ادب نے پہلے سے زیادہ ترقی کی۔ مذہب کے معاملے میں کئی مکتبِ خیال کے لوگ پیدا ہوئے اور بحث و مباحثے میں پڑ گئے۔ تاریخ کا مطالعہ ضروری قرار دیا گیا۔ انسائیکلوپیڈیا، خلاصے اور مجموعہ ہائے مضامین طبع ہوئے۔ لوگوں نے تاریخ میں اتنی دلچسپی لی کہ شاعری تک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

طب، ریاضی، ہیئت اور علم نباتات پر کتابیں لکھی گئیں۔ پھولوں اور پھلوں پر اس وقت بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ ترش پھلوں کی ایک کتاب اپنے موضوع پر غالباً قدیم ترین ہے۔ اسی زمانے میں گنتارا استعمال ہُوا۔ آج بھی چین کے بازاروں اور گلیوں میں ہر قسم کے حساب کتاب کے لیے گنتارا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

اہلِ مغرب غالباً سنگ خاندانوں کو اُن خوب صورت برتنوں اور تصویروں کا بانی مبانی سمجھتے ہیں جن کا سلسلہ اس زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ چینی کے برتن بہت قبل بنائے جانے لگے تھے لیکن اب فن کاروں نے انھیں ذریعۂ اظہار بنا دیا۔ اِن فن پاروں کو آسانی سے کانسی اور پتھر کے قدیم مجسموں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ سادگی کی خاطر عام طور سے

صرف ایک چمک دار رنگ استعمال کیا جاتا تھا۔ پتھروں میں کئی طرح کے رنگ ہوتے تھے، گہرے بھی اور ہلکے بھی۔ چینی کے برتن جو یورپ میں بڑے مشہور ہوئے، اِسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہانگ چو کے قریب خوب صورت جھیلیں اور پہاڑ واقع تھے، مناظرِ فطرت عام تھے، لہٰذا یہ شہر اچھی تصویروں کا مرکز بن گیا۔ سمندر بھی کچھ زیادہ دُور نہ تھا اور نباتات کی افراط تھی۔ اسی زمانے میں یک رنگی تصویریں عروجِ کمال کو پہنچیں۔ مناظر کا بادشاہ چینی مصوّر سیا کوئی[1] خاص طور سے سمندر اور ساحل کا دلدادہ تھا۔

جب سنگ خاندان کے آخری رہنما نے سمندر میں کُود کر خودکشی کر لی تو چین کا یہ قیمتی ورثہ کبلے خاں کے ہاتھ آیا۔ لیکن اس حکمراں کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ چین پر خواہ کسی کی بھی حکومت رہی، اہلِ چین کی خصوصیات تبدیل نہیں ہوئیں۔ کبلے خاں کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیرونی ممالک جو چین کو تسلیم کرتے تھے، اس کی حکومت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ کوریا، جاپان، انڈوچین اور انام میں بغاوتیں ہوئیں۔

کُبلے خاں نے شمالی دارالخلافہ از سرِ نَو تعمیر کرایا اور اُسے اپنی حکومت کا پایۂ تخت قرار دیا۔ اُس نے امتحاناتِ مقابلہ کا طریقہ ختم کر دیا کیونکہ وہ اپنے آدمیوں کو اعلیٰ عہدے دینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ چینی زبان و ادب سے واقف نہیں تھے، اس لیے اِن امتحانات میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

مارکو پولو کے چچا اپنے ساتھ جو خط پوپ کے پاس لے گئے تھے، اُس کا کوئی خوش گوار اثر نہیں ہُوا۔ جب وہ چین واپس ہوئے تو ان کے ساتھ پچاس کی بجائے صرف دو اساتذہ تھے اور وہ بھی راستے کی صعوبت سے اس قدر گھبرائے کہ واپس چلے

---

[1] Hsia Knie

گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ اس مرتبہ ان کا بھتیجا مارکو بھی تھا جس کی عمر اکیس سال تھی۔ وہ ۱۲۷۵ء میں کمبالک پہنچے جہاں ان کی بڑی خاطر مدارت ہوئی۔

جب مارکو پولو وطن واپس ہُوا تو وہ وینس اور جنیوا کے درمیان ایک بحری جنگ میں پھنس گیا اور قید ہو گیا۔ اسی زمانے میں اس نے اپنی مشہور کتاب لکھی جس میں قبلائی خان کے چین کی تفصیل درج ہے۔ مارکو خود لکھنے پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا لیکن قید کے زمانے میں اس نے پیسا کے رسٹی شیالو[1] سے راہ و رسم بڑھائی اور اُسے چین کے حالات سُنائے۔ یہ شخص لکھنا جانتا تھا لہٰذا اس نے مارکو پولو کے بتائے ہوئے سب حالات قلم بند کیے اور اس طرح یہ کتاب[2] ہم تک پہنچی۔

اس مہم کا آغاز ۱۲۷۵ء میں ہُوا۔ مارکو کئی ایشیائی زبانیں بولنا سیکھ گیا تھا اور قبلائی خان کو اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے مارکو کو ایک طرح کا وزیر بنا دیا اور خاص امور انجام دینے کے لیے باہر بھیجا۔ وہ تین سال تک سنگ حکمرانوں کے پایۂ تخت ہانگ چو کا گورنر رہا۔ اس نے اپنی کتاب میں اس تین سالہ عرصے کی کیفیت درج کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ دوکانوں پر ریشم کی افراط تھی، مغربی جھیل کے چاروں طرف بہت سے باغات تھے جو شاعروں اور مصوّروں کو بے حد مرغوب تھے۔ مارکو نے پگوڈوں، قہوہ خانوں، کنجوں اور تفریحی کشتیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

۱۲۹۲ء میں کبلے خاں نے بادلِ ناخواستہ پولو حضرات کو وطن واپس ہونے کی اجازت دی۔ یہ لوگ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ خان کے پوتے کی دلہن بھی اُن کے ساتھ تھی جسے ایران جانا تھا۔ انھیں بحری سفر اختیار کرنا پڑا تاکہ وہ یورپ کے تمام ممالک تک خان کے پیغامات پہنچا دیں لیکن بدقسمتی سے کہیں دو سال بعد وہ منزلِ مقصود

---

[1] Rusticiano
[2] The Book

پر پہنچے۔ ان کا بہت سا سازوسامان ضائع ہو چکا تھا۔ اس وقت تک دولہا مر چکا تھا۔ لہٰذا اس شہزادی نے خان کے پڑپوتے سے شادی کرلی اور ہنسی خوشی رہنے لگی۔

پولو افراد بیس سال بعد وطن پہنچے تو سب لوگ بہت خوش ہوئے، وہ انھیں مُردہ سمجھ بیٹھے تھے۔ اہلِ وطن نے اُن کے استقبال میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا اور تمام اہم لوگوں کو مدعو کیا۔ جب دعوت ختم ہو گئی تو مارکوپولو نے وہ تین چوغے منگوائے جنھیں پہن کر انھوں نے سفر طے کیا تھا۔ اس نے ایک چاقو سے ان کی سیونیں کھولیں تو ہر طرح کے ہیرے جواہرات باہر نکل پڑے اور لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

مارکو پولو نے چین کے علاوہ ان تمام ملکوں کی کیفیت درج کی ہے جن سے وہ گزرے تھے۔ اگر آنے والی نسلیں اور کولمبس اس کی کتاب پر غور کرتے تو انھیں بڑی مدد ملتی لیکن لوگوں نے اُسے محض افسانہ سمجھا۔ آنے والے واقعات نے اس کی صداقت ظاہر کی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مارکو نے اپنی کتاب میں بعض باتیں درج نہیں کیں۔ شاید اس وجہ سے کہ اُسے ادب اور آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُس نے چاؤ منگ فو کی تصویروں کا کوئی ذکر نہیں کیا جنھیں خان بہت پسند کرتا تھا — سوار، حملہ آور، منگولی گھوڑے اور درباریوں کی رنگین تصاویر۔

مارکوپولو کے سفر کے دوران ہی چین میں قطب نما پہلی بار استعمال ہوا۔ اگرچہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اس کی ایجاد کا سہرا عربوں کے سر ہے۔ عرصۂ دراز تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ مارکوپولو اپنے ساتھ چین سے قطب نما اور بارود یورپ لایا لیکن اب یہ خیال غلط ثابت ہو رہا ہے۔

کبلے خاں نے دنیا کی پہلی رصدگاہ تعمیر کرائی۔ اس کے کہیں تین سَو سال بعد یورپ میں پہلی رصدگاہ بنی جسے ڈنمارک کے شاہ فریڈرک سوم نے تعمیر کرایا تھا۔ ۱۲۷۹ء

میں کبلے خاں نے اپنے دارالخلافہ کی دیواروں پر کانسی کے بنے ہوئے ہیئتی آلات نصب کرائے جو ابتدائی آلات کے نمونے پر تیار کیے گئے تھے جنھیں سنگ خاندان کے ایک فرمانروا نے سیفنگ فو میں نصب کرایا تھا۔ مارکو پولو نے دیکھا تھا کہ اہلِ چین نقطۂ اعتدال[1]، راس السرطان، اور راس الجدی کے متعلق پیشگوئی کر سکتے تھے اور آبی گھڑیوں کی مدد سے وقت شمار کر سکتے تھے۔

جو لوگ پولو افراد کے چین کے دورانِ قیام میں یہاں آئے گئے، انھوں نے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ بہت سے پادری چین میں رہے اور خان اعظم نے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ ایک پادری نے چھ ہزار چینیوں کو عیسائی بنایا اور اپنے دس سالہ قیام کے بعد یہاں ایک گرجا گھر تعمیر کیا۔ پوپ نے اس کی مدد کے لیے یہاں اور پادری بھیجے۔ دوسرے بڑے شہروں میں بھی مذہبی ادارے قائم ہوئے۔

اسی طرح نسطوریوں نے بھی ترقی کی۔ ان میں سے ایک کو کمبالک کے ہیئتی ادارے کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ وہ ہان لن ادبی اکیڈمی کا رُکن بھی بنا۔ ایک اور نسطوری کو وزیر بنایا گیا۔ ایک اور شخص کو شہر چن کیانگ کا گورنر مقرر کیا گیا جو دریائے یانگ ٹسی کے کنارے واقع تھا۔

مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کیا گیا۔ بہت سے چینیوں کی رگوں میں اب بھی مسلمان عربوں کا خون رواں ہے۔

اب ادب کی ایک اور شاخ یعنی ناول نویسی نے ترقی کرنی شروع کی۔ اسی زمانے میں مشہور ناول "تین سلطنتوں کا رومان" تصنیف ہوا۔ ڈراموں اور عوامی گیتوں

---

[1] Equinoxes
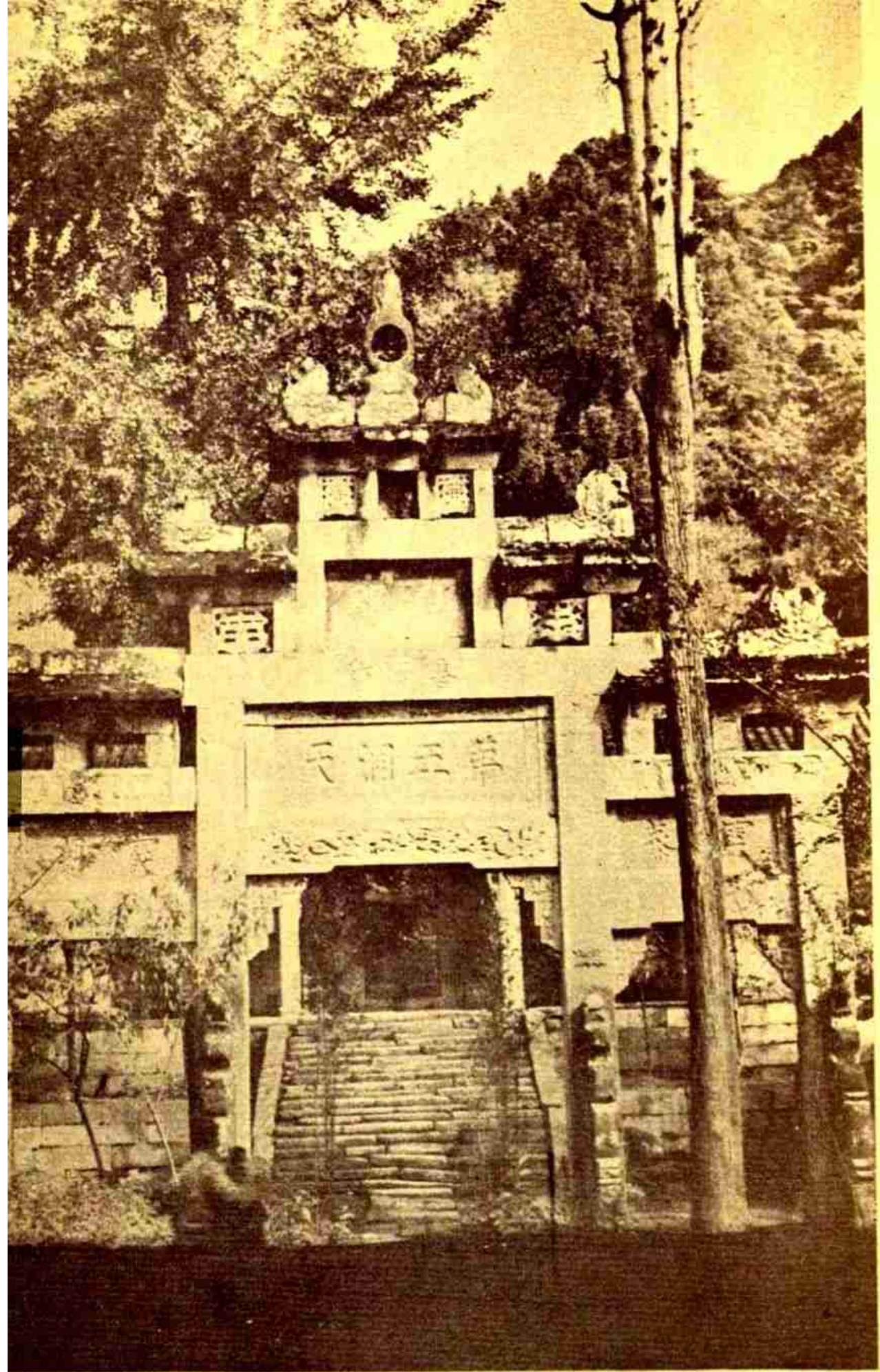
چینی طرز کا دروازہ - مغربی چین میں

مغربی چین میں ایک دیہاتی گاؤں
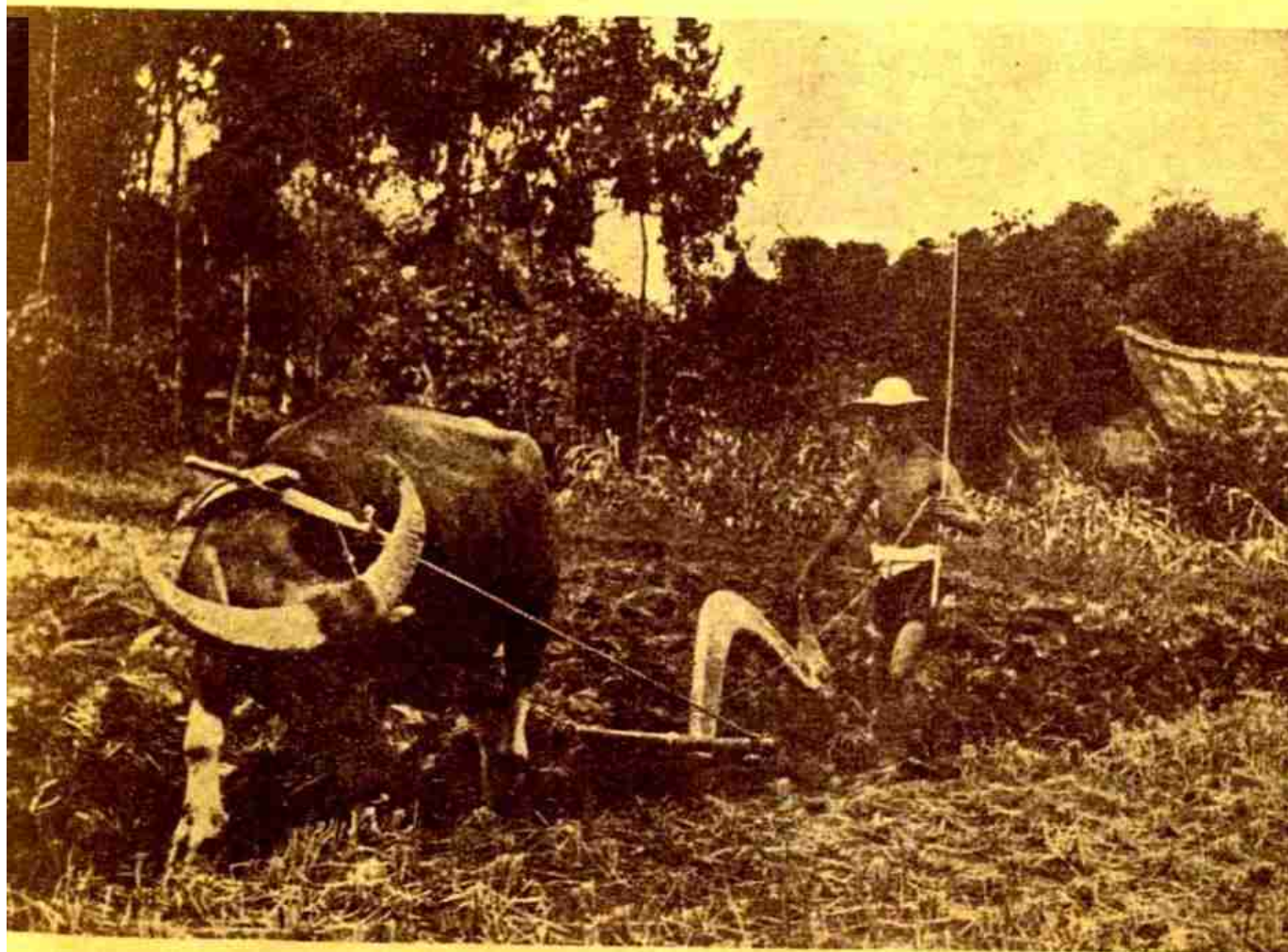
مغربی چین

فصل کاٹنے کے بعد کھیتوں میں ہل چلایا جا رہا ہے

ہانگ کانگ

کا

ایک بازار

مغربی چین میں دھان کی بوائی

چنگ تو
کے
مندر میں
مہاتما بدھ
کی
مُورتی

سوچو یُونیورسٹی - نانکن کا یادگاری چھپتر
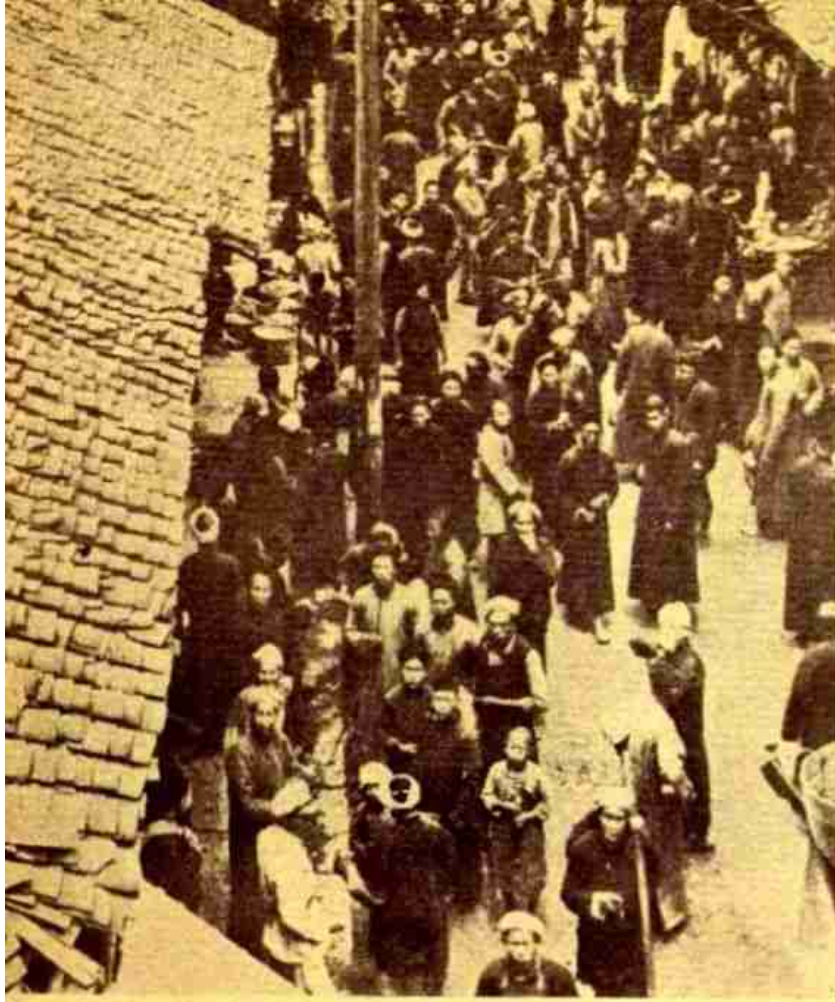
مغربی چین
کے
ایک قصبے میں
بازار کا منظر

مغربی چین
سچوان میں ایک دیہاتی مکان۔ اس کے گرد گنے کو خشک کرنے کیلئے چکّے رکھے ہیں

چنگ تو میں کنڈرگارٹن کے طالب علم مدرسے جا رہے ہیں
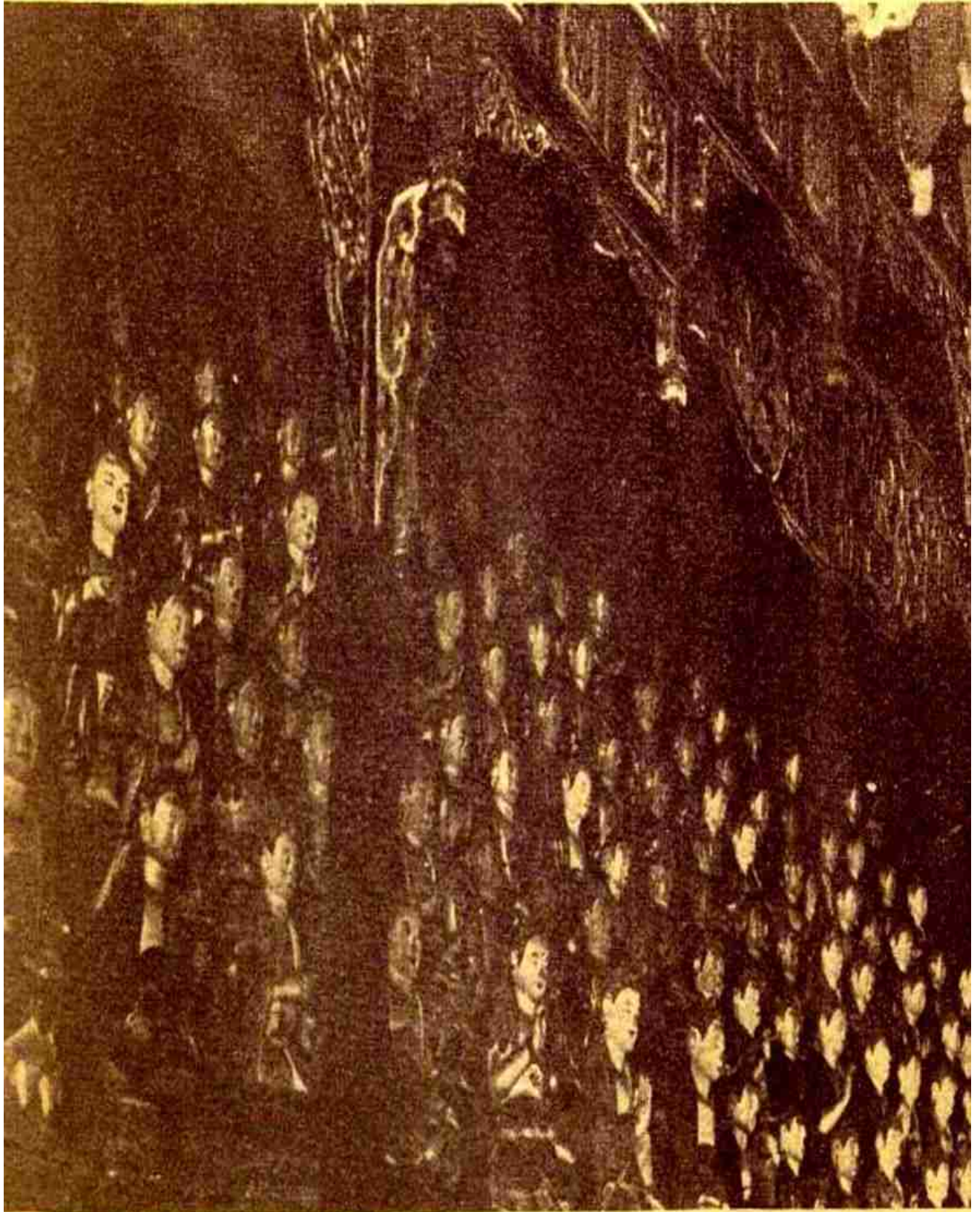
چین کے ایک مندر میں

بہت سی مورتیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ہر مورتی دوسرے سے مختلف ہے
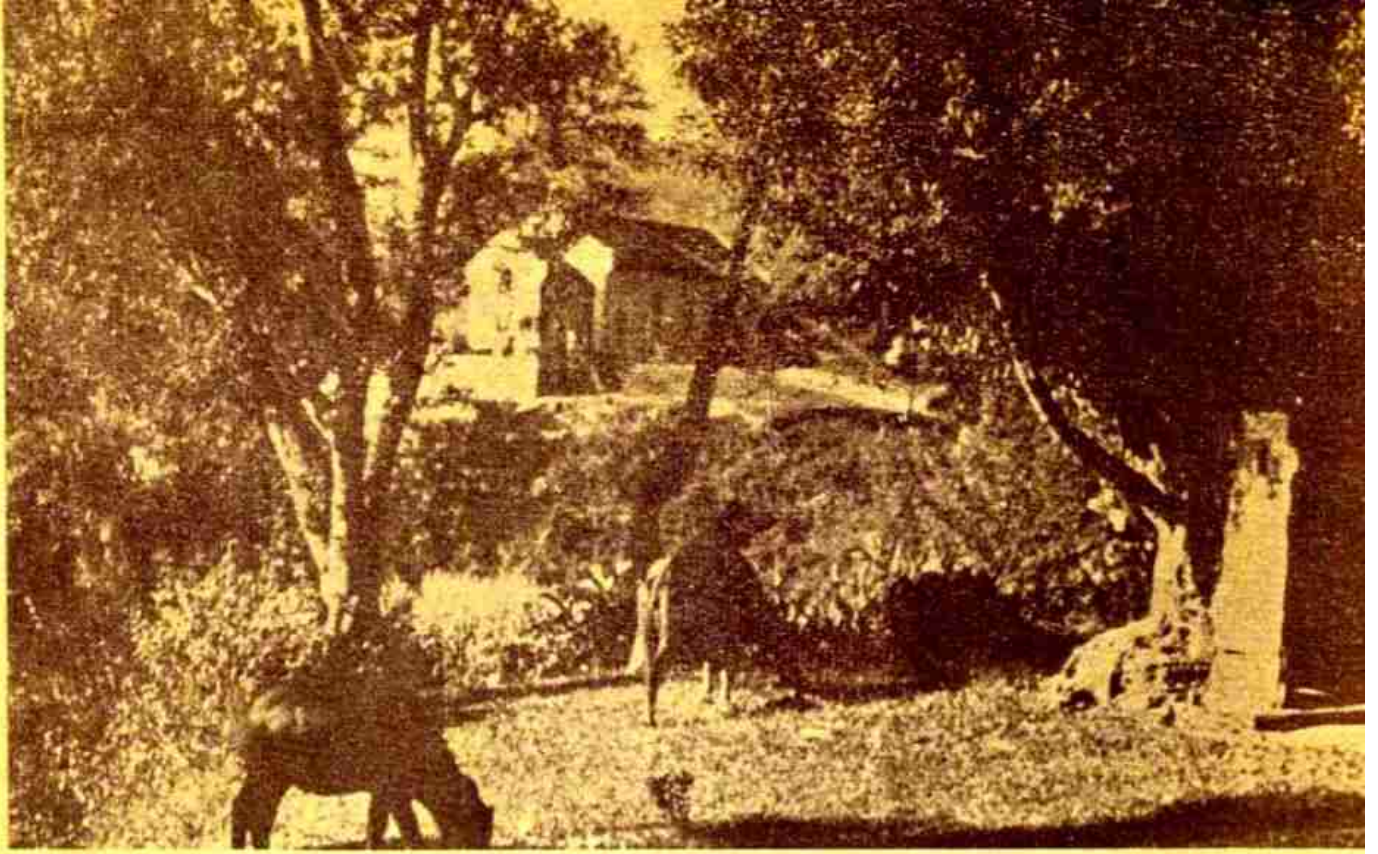
تائی پی کے قریب جذامیوں کے ہسپتال کا گرجا
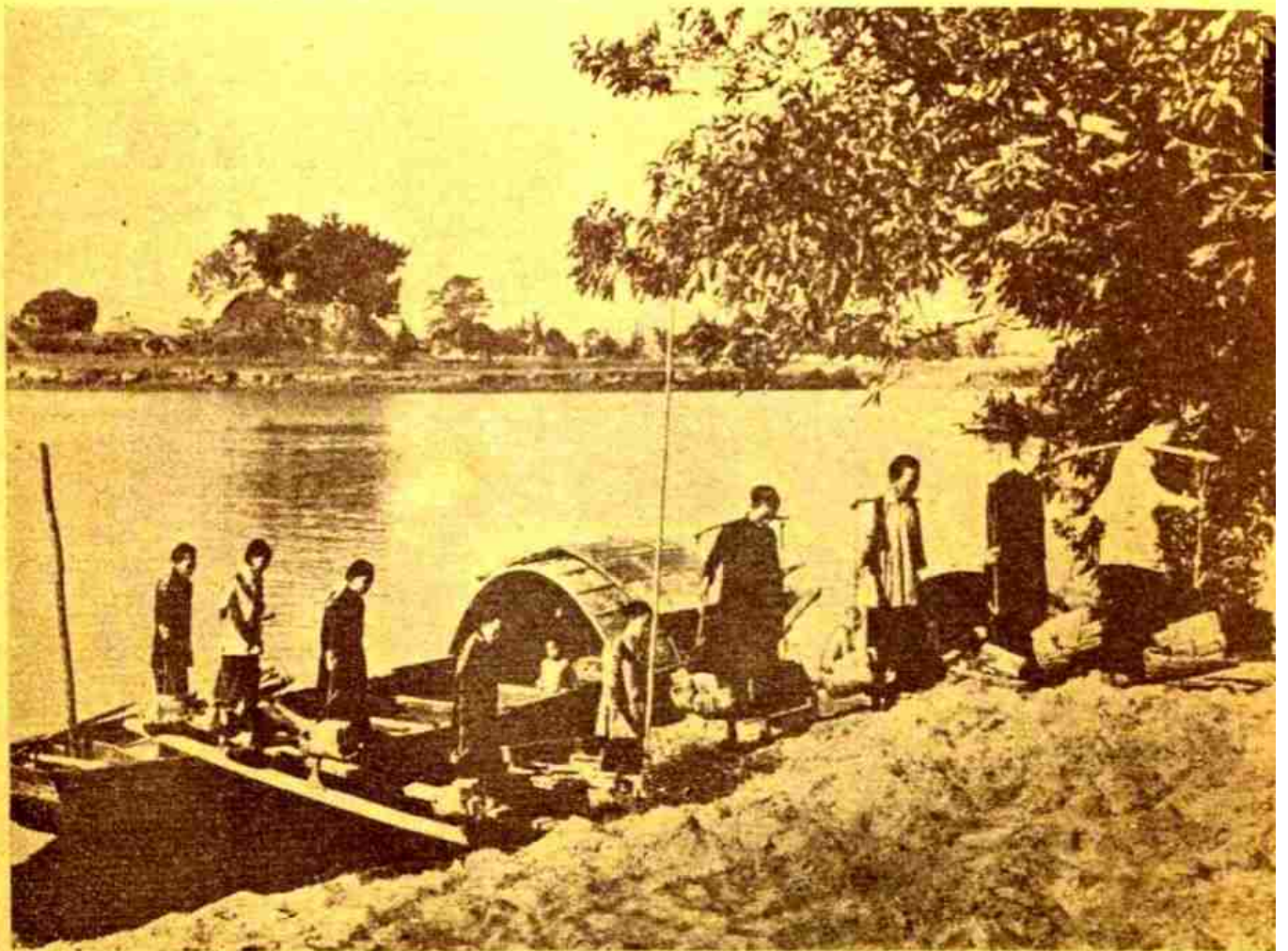
تنگ کن چین۔ مزدور عورتیں برتن بنانے کے لئے مٹی لے جا رہی ہیں
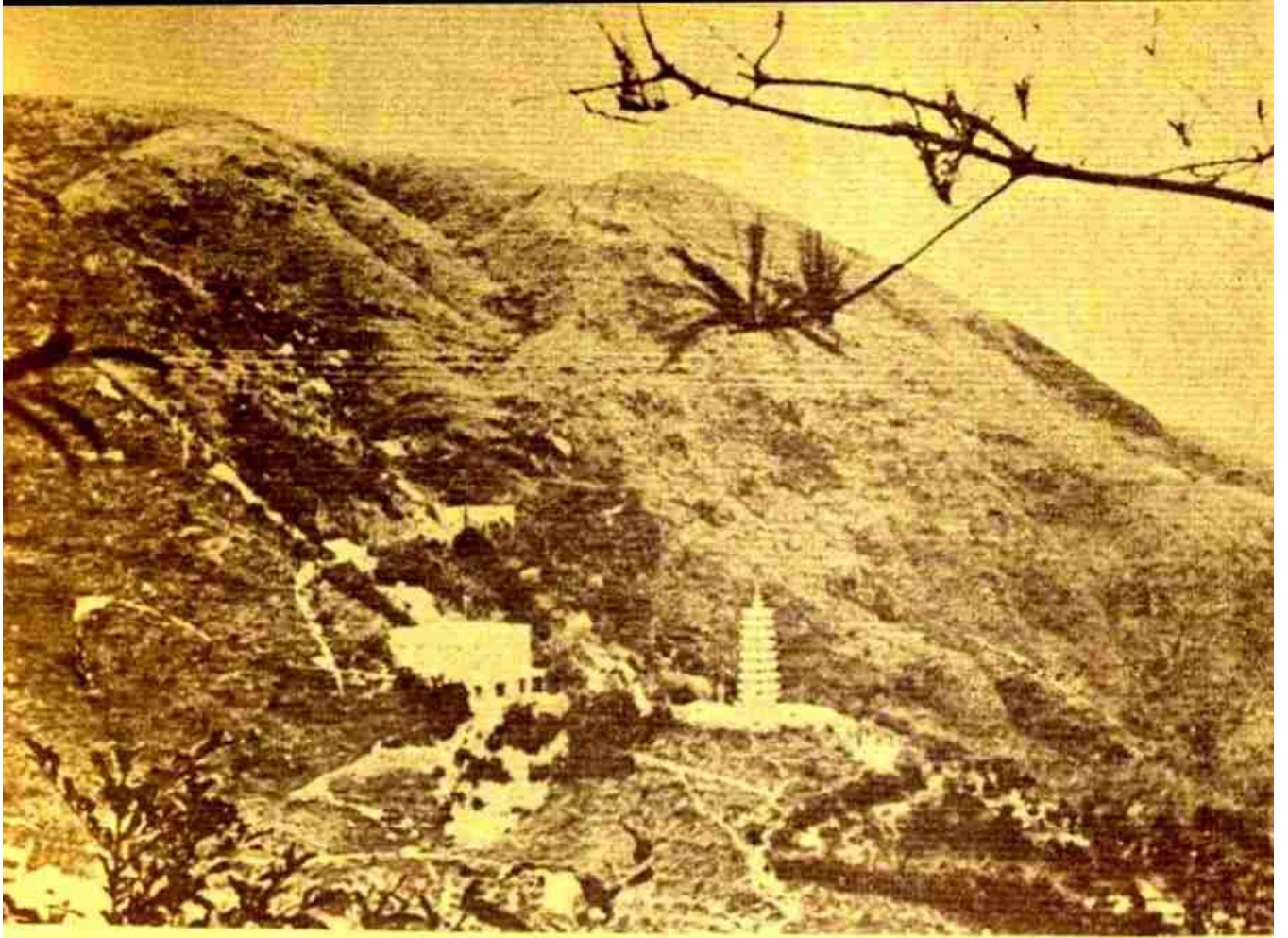
ہانگ کانگ کے نزدیک بدھوں کا ایک نو تعمیر ہوسٹل اور مندر

کاولون کے عقب میں نئی آبادی میں ایک گھاٹی

نے ادب کو تعلیم یافتہ طبقے کے علاوہ عوام سے روشناس کرایا۔

یہ سب پولو افراد کے قیام کے زمانے کی باتیں ہیں۔ یہ عہد نہایت شان دار تھا۔ اگرچہ چین پر غیر قوم کی حکومت تھی اور ان لوگوں نے اُسے ایک حد تک متاثر بھی کیا لیکن بنیادی طور پر اس میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ البتہ اہلِ چین نے ظروف اور پارچہ بافی کی صنعتوں پر دیرپا اثر چھوڑا۔ یورپ میں طباعت اور تصویرکشی کا فن بھی اس سے متاثر ہوا۔

چھٹا باب

چین پر مغرب کا اثر

(۱۶۴۴ء تا ۱۹۱۱ء)

منگولوں کے زوال کے بعد چین پر پھر تقریباً تین سَو سال تک اہلِ چین کی حکومت رہی۔ منگ کے معنی درخشندہ کے ہیں لیکن یہ دَور اس صفت کا حامل نہیں معلوم ہوتا۔ ملک کی سرحدیں اُن علاقوں تک بھی نہ پھیلیں جو منگولوں کے حملے سے قبل چین میں شامل تھے اور اگرچہ علوم وفنون بہت کچھ ویسے ہی رہے لیکن ان میں کوئی خاص ندرت باقی نہیں رہی تھی۔

اس عہد کے شروع میں مغرب سے چین کے تمام رشتے منقطع ہو گئے۔ کبلےخاں کے زمانے میں اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے تھے لیکن اب بند ہو گئے۔ عیسائی باشندے جن کی اُس زمانے میں بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ اب یکسر غائب ہو گئے۔ البتّہ منگ خاندان کے آخری دَور میں یہاں عیسائی مبلّغ اور تاجر پھر آنے لگے۔ انھوں نے مذہب اور تجارت کی آڑ میں اس مُلک پر یلغار کی۔ اِس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اب تک امریکا دریافت ہو چکا تھا۔ مُہم جُو لوگ نئی دُنیا سے تجارت کرنے کی غرض سے بحری راستوں سے مشرق کی طرف چل پڑے اور افریقہ و ہندوستان سے گزر کر چین تک آ پہنچے۔ مارکو پولو اور کولمبس کا نام بھی اسی سلسلے میں شامل ہے۔ لوگ کیتھے اور جزائر شرق الہند جیسے خوب صورت دیسوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ مغرب کی طرف چل کر مشرق کی طرف پہنچنا چاہتے تھے۔ اس

طرح امریکا کی دریافت عمل میں آئی۔

اس زمانے میں چین میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شمال اور مغرب کی طرف سے خشکی کے چند نہایت اہم راستے اس ملک میں آتے تھے لیکن اس کے ایک طرف سمندر بھی موجود تھا۔ اب وہ زمانہ آیا، جب یورپ اور امریکا نے چین میں گھسنے کی کوشش کی۔ اس اختلاط کا نتیجہ ظاہر تھا۔ اہلِ چین کے تخیل اور معاشرت دونوں میں اہم تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔

سب سے پہلے اہلِ پرتگال یورپ سے چین میں وارد ہوئے کیونکہ انھوں نے ہی سب سے پہلے راس امید کا چکّر لگا کر ہندوستان کے علاقے گوا پر قبضہ کیا تھا۔ ایک پرتگیزی شخص میجلان[1] نے ہی اس ہسپانوی مہم کی سربراہی کی تھی جس نے ۱۵۲۰ء میں ساری دُنیا کا چکّر لگایا تھا۔ پھر یہ لوگ منیلا (فلپائن) میں رہنے لگے جہاں میجلان کا انتقال ہُوا۔ اس کے بعد ولندیزوں نے چین میں داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن انھیں بحری قزاق کوک سنگا نے مار بھگایا۔ انھوں نے فارموسا میں جا کر پناہ لی۔ کوک سنگا آدھا چینی تھا اور آدھا جاپانی، لیکن وہ منچو لوگوں کا جانی دشمن تھا، جو شمال کی طرف سے چین میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔

۱۶۳۷ء میں جب اس حکمران خاندان کا زوال قریب تھا۔ انگریزوں کا ایک بحری بیڑا ساحلِ کینٹن پر پہنچا۔ چند توپوں نے انھیں مکاؤ بندرگاہ میں داخل ہونے سے روکا لیکن پھر وہ خاموش کردی گئیں۔ یہ تھی ایسٹ انڈیا کمپنی کی یلغار کی ابتدا، جس کا ہندوستان اور چین کی تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ اسی زمانے میں روسی باشندے بھی شمال کی طرف سے چین میں گھُسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ نے پیپنگ میں رہنا بھی شروع کر دیا تھا۔

---

[1] Magellan

سوداگروں کے ساتھ ساتھ مذہبی مبلّغین بھی آ موجود ہوئے۔ یورپ میں مہم جوئی اور مذہبی جوش عروج پر تھا۔ جہاں کہیں تاجروں کے قدم جمتے تھے رومن کیتھولک وہیں پہنچ جاتے تھے۔ ان مبلّغین میں فرانسس[1] ژواژ کا نام پہلے آتا ہے لیکن وہ چین میں نہ گھس سکا۔ اُسے کینٹن کے قریب ایک جزیرے میں مقیم رہنا پڑا اور وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔

ژواژ کے بعد ایک اطالوی پادری میٹیو[2] رِشی ۱۵۸۲ء میں پیپنگ پہنچا۔ وہ اٹھائیس سال تک وہاں رہا۔ اس کے علم و فضل کی قدر کی گئی۔ اس نے چینیوں کی طرح رہنا شروع کیا اور اُن کے ادب کا غور سے مطالعہ کیا۔ اس نے ریاضی اور ہیئت میں کچھ اضافہ کیا اور اہلِ چین اُسے اپنا دوست سمجھنے لگے۔

چائے، ریشم، تصویروں، مجسّموں اور گرم مسالوں کی تجارت جاری تھی لیکن سب سے زیادہ کاروبار چینی کے برتنوں کا تھا۔ اس مقصد کے لیے بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے جہاں نہایت خوب صورت اور رنگین برتن تیار ہوتے تھے۔ اس کے بعد چینی برتنوں، ریشم اور چائے کا شمار چین کی بہترین سوغاتوں میں ہونے لگا۔

جب منچو باشندوں نے ۱۶۴۴ء میں چین پر قبضہ کر لیا تو وہ دنیا کا عظیم ترین ملک بن گیا۔ ان فاتحین کو اپنے مقصد میں ذرا سی بھی دشواری پیش نہیں آئی کیوں کہ یہ لوگ دوسرے حملہ آوروں کی طرح غیر نہیں تھے۔ اُن کے جسم میں چینی خون رواں تھا۔ اہلِ چین باہمی تفریق سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ شاید منچو باشندوں کی حکومت اُن کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔ اِن فاتحین نے شروع سے ہی چینی تہذیب اختیار کر لی اور بالکل چینی بن گئے۔

---

[1] Farancis Yavier

[2] Matteo Ricci

مقابلے کے امتحانات پھر جاری ہو گئے ۔ منچو اور چینی دونوں باشندوں کو اعلیٰ عہدے عطا ہوئے ۔ لیکن چینیوں کو زیادہ اعزاز ملا ۔ اسی زمانے میں سر پر چوٹی رکھنے کا رواج شروع ہوا جو اہلِ مغرب کے نزدیک چینیوں کی سب سے بڑی شناخت ہے ۔ مرد سر کا درمیانی حصّہ نہیں منڈواتے تھے ۔ ان کے بال لٹوں کی شکل میں لٹکے رہتے تھے ، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منچو حکومت کے وفادار ہیں ۔ یہ صورت انقلاب آنے کے وقت تک برقرار رہی پھر نہایت تیزی سے غائب ہو گئی ۔

منچو حکمرانوں نے تین سَو سال تک چین پر حکومت کی ۔ کسی دوسری قوم نے اتنا عرصہ فرمانروائی نہیں کی ۔ اِس دَور کے نصفِ اوّل کو چینی تاریخ کا سنہری باب کہا جا سکتا ہے ۔ اس کی سرحدوں کو اتنی وسعت پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی ۔ چین میں اُس وقت اٹھارہ صوبے شامل تھے ۔ ان کے علاوہ منچوریا ، منگولیا ، سن کیانگ ، تبت بھی چین کا حصّہ تھے ۔ بہت سے پڑوسی ممالک اُسے خراج ادا کرتے تھے ۔ آبادی کثیر تھی اور لوگ خوش حال ۔ اُس وقت غالباً چین دُنیا کا امیر ترین مُلک تھا ۔ اس کی آبادی سلطنتِ برطانیہ ، ہسپانیہ ، فرانس ، روس ، ترکی اور مغلوں کی حکومت سے زیادہ تھی ۔ یورپ اپنے قوانین کے اعتبار سے وحشی تھا ۔ چنگ[1] یا منچو خاندان کے ڈیڑھ سَو سالہ دَورِ حکومت کے بعد اس ملک پر اہلِ مغرب کی یلغار شروع ہوئی ۔ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۲ء تک لڑائیوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ پھر صُلح ہوئی ۔ اس زمانے میں چین میں دو حکمران ایسے گزرے ہیں جن کے نام اگر تاریخ نہیں بتاتی تو ان مشہور مہروں سے معلوم ہو جاتے ہیں جو چینی کے برتنوں پر ثبت ہیں ۔ ان شہنشاہوں کے نام تھے کیانگ سی[2] اور چین لنگ[3] ۔ ان کی حکومت ایک سَو تیس سال قائم رہی اور چین نے اِس عہد میں بڑی ترقی کی ۔

---

[1] Ch'ing [2] K'ang Hsi [3] Ch'ien Lung

کیانگ سی نے ۱۶۶۱ء سے ۱۷۲۲ء تک حکومت کی۔ اس زمانے میں فرانس میں لوئی چہاردہم، روس میں پیٹر اعظم، انگلستان میں ولیم سوم اور ہندوستان میں اورنگ زیب کی حکومت تھی۔ وہ بڑا اچھا سوار تھا اور خود اپنی رعایا کی حالت دیکھنے باہر نکلتا تھا۔ اُسے طرزِ حکومت کی بجائے کارکردگی سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ حکمراں ہونے کے علاوہ طالب علم بھی تھا۔ اس کی یادداشت لاجواب تھی اور وہ بڑا متجسس شخص تھا۔

اُسے سب سے پہلے جنوب کے باغیوں کو پسپا کرنا پڑا کیونکہ وہ لڑکپن میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس کا ولی برسوں تک حکومت کرتا رہا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ جنوب میں بہت سے جاگیردار خودمختار ہو گئے۔ ان سے فارغ ہو کر وہ منگولوں اور تبتیوں کی طرف متوجہ ہُوا۔ یورپی باشندے سمندر کے راستے برابر چین میں داخل ہو رہے تھے۔ اُس نے اُن کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا اور ان پر پابندیاں لگائیں۔ انھیں تجارت کی غرض سے صرف مکاؤ میں رہنے کی اجازت تھی۔

شمال میں رُوس اُسے تنگ کر رہا تھا۔ اس کے پیش رو خاندان کے زمانے میں کچھ روسی پیپنگ میں آ گئے تھے۔ اب انھوں نے دریائے آمور کی وادی میں چھوٹی چھوٹی نو آبادیاں قائم کرنی شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُن سے لڑائی ٹھن گئی۔ کیانگ سی نے ایک روسی چوکی پر قبضہ کر لیا اور یرغمال حاصل کیا۔ بعد میں صلح ہو گئی، جو صلح نرچنسک[1] کہلاتی ہے۔ یہ تھی پہلی صلح جو اہلِ چین اور کسی غیر مُلکی قوت کے درمیان ضابطۂ تحریر میں آئی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انصاف سے کام لیا گیا۔ بعد میں چین نے جتنی صلحیں کیں وہ بڑی حد تک بیرونی قوت سے مجبور ہو کر کیں۔

کیانگ سی کا برتاؤ عیسائی پادریوں کے ساتھ دوستانہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ان پر اپنا اقتدار قائم رکھا لیکن اس نے اُن پر ظلم نہیں کیا اور اُن کا

---

[1] Nerchinsk

مطالعہ کیا۔ اُسے سائنس اور موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی سلطنت کا نقشہ تیار کرایا اور اہلِ روس سے بات چیت کرنے میں ان سے مدد لی۔ بادشاہ نے اِن پادریوں کے لیے بار بار گرجا گھر تعمیر کرائے۔ ۱۶۹۲ء میں اس نے پورے ملک میں اعلان کرایا کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا جائے۔ ۱۷۰۵ء میں چین میں دو لاکھ عیسائی موجود تھے جن میں سے زیادہ تر سربرآوردہ تھے۔

چین کے ایک شہنشاہ کی ملکہ کے پَیر بہت چھوٹے تھے جنھیں وہ بہت پسند کرتا تھا۔ اسی وقت سے چین میں لڑکیوں کے پَیر باندھنے کا رواج شروع ہُوا تاکہ اُن کے پَیر بڑھنے نہ پائیں۔ جس طرح ہر نیا فیشن تیزی سے پھیلتا ہے، اسی طرح چینی عورتیں بھی یہ سمجھنے لگیں کہ اگر ان کی بیٹیوں کے پَیر بڑے ہو گئے تو انھیں اچھے شوہر نہیں مل سکیں گے۔ کیانگ سی کو چیوں پر یہ ظلم سخت ناگوار گذرا اور اس نے یہ فیشن ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی عظیم ملک کو جس میں دیہاتیوں کی تعداد بہت زیادہ ہو، کسی مسلّمہ رواج سے نجات دلانا آسان کام نہیں ہوتا تاہم چین کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ حکومت نے اس قسم کی کوشش کی تھی۔

دریائے زرد میں اب بھی وقتاً فوقتاً سیلاب آتے رہتے تھے اور تباہی کا باعث ہوتے تھے۔ بادشاہ نے پشتوں کی طرف توجّہ دی اور شمالی میدان میں رہنے والوں کی مدد کی۔ اس نے کتب خانوں میں توسیع کی، قدیم ادبی شہ پاروں کے نئے ایڈیشن طبع کرائے، طلبا کو وظائف دیے اور چونکہ وہ خود ادب سے غیر معمولی دلچسپی رکھتا تھا، اس لیے اُس نے اُسے فروغ دینے کے لیے سب کچھ کیا۔

اس کے دورِ حکومت کے آغاز سے پہلے ہی چنگ ٹی چن[1] میں ظروف سازی کا کارخانہ انقلاب کے زمانے میں تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے یہ کارخانہ از سرِ نو قائم کیا

---

[1] Ching-te-Chen

اور اس سے ایسے خوب صورت برتن نکلے جنھوں نے ساری دنیا میں اس کا نام روشن کیا۔

کیانگ سی کا اُنہتر ۶۹ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ چین کی پوری تاریخ میں اس کا دورِ حکومت طویل ترین ہونے کے علاوہ بہترین بھی ثابت ہُوا۔ بڑھاپے میں اُسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ وہ اپنا جانشین کسے مقرر کرے۔ سب سے بڑے بیٹے کو حکومت سونپنے کا کوئی قانون نہیں تھا اور اس کے بہت سے بیٹے تھے۔ بالآخر اس نے ایک بیٹے کو منتخب کیا جس نے بارہ سال تک حکومت کی۔ اس میں کوئی خوبی نہیں تھی بجز اس کے کہ وہ کیانگ سی کا بیٹا اور چین لنگ[1] کا باپ تھا۔

چین لنگ نے چین پر ۱۷۳۶ء سے ۱۷۹۶ء تک حکومت کی اور اُسے سب سے زیادہ وسعت بخشی۔ اس نے مغربی منگولوں کو مغلوب کیا جو کیانگ سی کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ چین لنگ مغرب میں اور آگے بڑھ گیا۔ اس نے دشمنوں کو ہرا کر ہان اور سنگ خاندانوں پر سبقت حاصل کی۔ چین میں یہ علاقہ ان کے دورِ حکومت میں بھی شامل نہ تھا۔ اس نئے علاقے کا نام سنگ کیانگ پڑا۔

چین لنگ نے یورپی باشندوں اور تاجروں کے ساتھ اپنے دادا جیسا برتاؤ کیا۔ ۱۷۹۳ء میں ارل آف میکارٹنے کی سرکردگی میں برطانیہ کا سفارت خانہ پیپنگ آیا۔ ان لوگوں کو توقع تھی کہ ان کا شان دار استقبال کیا جائے گا۔ جہازوں کے جھنڈوں تک پر یہ لکھا ہُوا تھا۔ ''سفیرِ انگلستان جو اپنے ساتھ نذرِ عقیدت لایا ہے۔'' ارل نے اپنا معاملہ بڑی خوبی سے پیش کیا لیکن اپنی توقعات کے مطابق وہ تمام تجارتی مراعات حاصل نہ کر سکا۔

رومن کیتھولک پادریوں کو دارالخلافے کے ہیئتی ادارے میں ملازم رکھا گیا، اُن سے یورپی طرز کی تصویریں بنوائی گئیں اور پیپنگ کے باہر شاہی گرمائی محل میں طرح طرح کی

---

[1] Ch'ien Lung

عمارتیں تعمیر کرائی گئیں۔ انھیں کھلے بندوں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت نہیں تھی۔ اگر وہ خاموشی سے بھی ایسا کرتے تھے، تو انھیں سختی سے روک دیا جاتا تھا۔ کیتھولک پادریوں کو اس زمانے میں وہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ جو کیانگ سی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ متذکرہ بالاپابندی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ خود یورپ میں مشنری تحریک کمزور پڑتی جارہی تھی۔ وہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ یہ انقلابِ فرانس کا زمانہ تھا۔ چرچ کی آواز کمزور پڑ چکی تھی، پُرآشوب دَور نے اُس کی مالی حالت پر بھی بُرا اثر ڈالا تھا۔

چین لنگ کو تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ مثلاً شاعری، حالاتِ حاضرہ اور کتابوں کے دیباچے وغیرہ لکھنا۔ اُس نے دوسری کتابوں کے اقتباسات حاصل کیے، پھر بھی وہ منگ ہوانگ (سانگ خاندان) کی ہمسری نہ کرسکا۔

امن و امان قائم رہنے کی وجہ سے شہروں کی دولت اور وسعت میں اضافہ ہُوا۔ زیادہ زمین زیرِ کاشت لائی گئی۔ اس زمانے میں چین کی آبادی غالباً تیس کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ بڑھاپے میں چین لنگ نے ایسی باتوں کی اجازت دے دی جو اُس کا دادا ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہ کرتا۔ اس نے اپنے دوستوں کو اعلیٰ منصب عطا کیے اور انھیں دولت سمیٹتے دیکھتا رہا۔ شاید اس وجہ سے کہ بڑھاپے نے اُس کی قوّت سلب کر لی تھی۔ بہرکیف اُس کے مرتے ہی ملک میں بغاوت پھُوٹ پڑی۔

اگرچہ اس ڈیڑھ سَو سالہ دورِ حکومت میں کوئی طبع زاد کام نہیں ہُوا، تاہم آرٹ میں چند نہایت دلچسپ چیزوں کا اضافہ ہُوا۔ چڑیوں، پھُولوں اور جانوروں کی اتنی اچھی تصویریں پہلے کبھی تیار نہیں ہوئی تھیں۔ ایک قسم کے سماق کے دودھ سے خاص قسم کا روغن تیار کیا جانے لگا۔ اس کی تیاری پر بڑی محنت آتی ہے، لیکن صندوقوں، کشتیوں، پردوں، پیالوں اور گلدانوں پر یہی روغن استعمال کیا جاتا تھا۔

لوگ بڑی محنت سے ہاتھی دانت، سینگ، پتھر اور لکڑی پر اپنی صنّاعی کا کمال پیش کرتے تھے۔ پھر چینی مٹّی کے برتن تھے جو کیانگ سی کے زمانے میں عروج حاصل کر چکے تھے۔ اب اُس سے انسانوں، جانوروں اور دیوتاؤں کے مجسّمے بنائے جانے لگے۔ اِس روغن کی ایک نیم شفّاف قسم زیادہ پسند کی جانے لگی۔ اُسے استعمال کرنے کا ایک طریقہ جو اب بھی رائج ہے، یہ تھا کہ مٹّی کے کچّے برتنوں میں شگاف کرکے یہ روغن اُن میں بھر دیا جاتا تھا اور پھر اُنھیں پکایا جاتا تھا۔ ان پر چاول جیسے نقوش اُبھر آتے تھے چنانچہ چنگ ٹی چن اب بھی ظروف سازی کا سب سے بڑا مرکز تھا لیکن بہت سے نجی کارخانے بھی کام کر رہے تھے۔

اِس زمانے میں امتحاناتِ مقابلہ پر پہلے سے زیادہ زور دیا گیا، اِسی طرح ادب کی طرف خاص توجّہ صرف کی گئی لیکن اس عہد کو تخلیقی نہیں کہا جا سکتا۔ طباعت مقدار کے لحاظ سے تو بہت کی گئی لیکن وہ اُونچے درجے کی نہیں تھی۔ شاعری کی اچھی صنفیں ابھی باقی تھیں، ناولوں کی تعداد اور خوبیوں میں بھی اضافہ ہُوا۔ چین کا مشہور ترین ناول "لال کوٹھری کا خواب" ساؤ ہسیوہ چن[1] نے اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا۔

سرکاری مذہب اب بھی کنفوشی مذہب ہی تھا۔ اگر ہم اُسے مذہب کہہ سکتے ہیں۔ اب اُس نے چند صدیوں پہلے کے مقابلے میں اور بھی قوّت حاصل کر لی تھی۔ شاید اِسی وجہ سے بعض فلسفیوں نے کنفوشیت کو بدھ مت کے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کی۔ عجیب بات ہے کہ گو کنفوشیت کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہی تاہم کم از کم لاکھوں دیہاتیوں کے لیے بدھ مت ہی جائے پناہ بنا رہا۔ ساتھ ساتھ وہ کنفوشیس کی بھی عزّت کرتے رہے اور اس کے بتائے ہوئے راستوں پر چلتے رہے۔

---

[1] T,sao Hsueh-Ch'in کے The Dream of the red Chamber

چین میں منچو دورِ حکومت کے نصف آخر میں یورپ کا اثر بڑھا۔ یورپی باشندوں نے وہاں تجارتی چوکیاں قائم کرنے کی کوشش کی۔ وہ کینٹن میں پہلے سے کاروبار کر رہے تھے۔ ان کے لیے کچھ جگہ مخصوص کر دی گئی تھی۔ اگر وہ باہر نکلتے تھے تو کسی محافظ کو ساتھ لے کر۔ اُس زمانے کے کئی دلچسپ قصے مشہور ہیں۔ جب یہ لوگ بلند صاف ستھری عمارتوں میں رہتے تھے اور دریا کی طرف دیکھتے رہتے تھے کہ کب کوئی جھنڈا نظر آتا ہے۔ جھنڈا نظر آنے کا یہ مطلب تھا کہ وطن سے کوئی تجارتی جہاز آگیا ہے۔ سامانِ تجارت وھامپو پر اُتارنا پڑتا تھا اور وہاں سے کشتیوں میں کینٹن لایا جاتا تھا۔ امریکی اور برطانوی باشندے پرتگیزوں کی اجازت سے مکاؤ جا سکتے تھے، جو موخّرالذکر کے قبضے میں تھا۔ اُس زمانے میں یہ بندرگاہ بڑا خطرناک سمجھا جاتا تھا اور بدنام بھی تھا۔ اُس کی پہاڑیوں میں اُن افراد کی عجیب وغریب قبریں اب بھی موجود ہیں۔ جنھوں نے چین کے ساتھ تجارت کی ابتدا کی تھی۔

چونکہ انگلستان کی بحری قوت سب سے زیادہ تھی اور یورپ سے صنعتی انقلاب کی وجہ سے بہت سے لوگ باہر نکل رہے تھے، لہٰذا انگلستان نے سوچا کہ اب چین کو دوسرے ممالک سے زیادہ تجارتی سہولتیں دینی چاہئیں۔ مغربی قوّتوں کو چین کی یہ بات بھی بہت بُری لگی کہ وہ دُنیا کی کسی قوم کو اپنا ہم پلّہ نہیں سمجھتا اور ان کے ساتھ انصاف نہیں برتتا۔ اس کے برعکس چین اپنے آپ کو اس معاملے میں قطعی خود مختار سمجھتا تھا کہ وہ کس ملک کو تجارت کرنے اور چوکیاں قائم کرنے کی اجازت دے اور کس کو نہ دے۔ یہی اختیار اِس زمانے میں حقِ خود اختیاری کہلاتا ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ بُرا نکلا۔ انگلستان کے لیے اور زیادہ پیچیدگی اِس وجہ سے بھی پیدا ہوگئی کہ وہ چین کے ساتھ افیون کی تجارت کر رہا تھا۔ چین میں افیون عرصۂ دراز سے استعمال ہو رہا تھا۔ امریکا اور دوسرے ممالک بھی چوری چھپے اِس تجارت میں

شریک تھے لیکن سب سے زیادہ فائدہ انگلستان کو ہو رہا تھا، لہٰذا جھگڑا اُس کی طرف سے شروع ہُوا۔

یکایک ایک واقعہ ایسا رونما ہُوا جس کا فیصلہ فوراً ضروری تھا۔ چینی حکومت دیکھ رہی تھی کہ افیون کا زیادہ استعمال عوام کو تباہ کر رہا ہے، دوسرے اس کی قیمت چاندی دے کر ادا کرنی پڑتی تھی۔ لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ کینٹن میں افیون کی تمام پیٹیاں ضبط کر لی جائیں اور اس کی تجارت بند کر دی جائے۔ اس کے علاوہ غیر ملکی سوداگروں سے یہ وعدہ بھی لیا گیا کہ وہ آئندہ یہ تجارت نہیں کریں گے۔ جس شخص کو یہ احکام نافذ کرنے تھے اُسے یہ حکم بھی ملا کہ وہ تمام سفید فام لوگوں کو اُن کے کارخانوں میں قید کر دے۔ افیون کی بیس ہزار پیٹیاں ضبط کر لی گئیں اور ضائع کر دی گئیں۔ کچھ سوداگروں نے آئندہ یہ کاروبار نہ کرنے کا عہد بھی کر لیا، لیکن برطانوی تاجر پہلے مکاؤ میں پناہ گزیں ہوئے، پھر انھیں ایک جزیرے میں چلے جانے کا حکم ملا جو اس وقت تو غیر آباد تھا لیکن بعد میں ہانگ کانگ کہلایا، لیکن ہنگامہ جاری رہا اور ۱۸۳۹ء میں جنگ چھڑ گئی جو "جنگِ افیون[1]" کہلاتی ہے۔ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

برطانوی بحریہ چین کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوی تھا، لہٰذا ہر جنگ کے بعد صلح نامہ ہُوا جس کے تحت چین نے بادلِ نخواستہ کسی نہ کسی بندرگاہ پر برطانیہ کو تجارتی سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ ۱۸۴۲ء میں نانکنگ میں ایک صلح نامے پر دستخط ہوئے جس کے مطابق تاجروں کو کاروبار کرنے اور پانچ بندرگاہوں میں مقیم رہنے کی اجازت مل گئی۔ ہانگ کانگ برطانیہ کے حوالے کر دیا گیا تاکہ وہ اُسے اپنا بحری مرکز بنالے۔ اس کے علاوہ بہت سی افیون ضائع کر دینے کی وجہ سے

---

[1] Opium War

چین کو محصول میں کچھ رعایت دینی پڑی اور قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔

اس کے بعد امریکا اور دوسرے ممالک نے بھی چین سے اسی قسم کی مراعات کا مطالبہ کیا۔ اس طرح چین میں چند نئی بندرگاہیں قائم ہوئیں جہاں سوداگر، اُن کے خاندان اور بعد میں مذہبی مبلغین رہنے سہنے لگے۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں نے اپنے لیے جداگانہ قوانین وضع کرلیے اور عدالتیں قائم کیں۔ شہروں کی صفائی ستھرائی، کاروبار اور تفریح گاہیں سب چیزیں انھوں نے خود سنبھال لیں۔ چینی باشندوں کو ان تفریح گاہوں میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ شروع میں جو پانچ بندرگاہیں اس مقصد کے لیے قائم ہوئیں، ان میں شنگھائی بھی شامل تھا جسے بعد میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ یہاں فرانسیسی، برطانوی، امریکی اور دوسری اقوام کے افراد کو ہر طرح سے رعایت ملی۔ یہ بندرگاہ چینی اقتدار سے تقریباً آزاد ہوگئی اور اچھی بُری چیزوں کا عجیب سا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

جب چین میں جبری طور پر اس قسم کے مرکز کُھلے تو فوراً بہت سے سوداگر اور پادری یہاں آموجود ہوئے بالکل اسی طرح جیسے کیلی فورنیا میں سونے کی دوڑ شروع ہوئی تھی۔ جن لوگوں کو وہاں یہ قیمتی دھات نہ مل سکی، انھوں نے دوسری جگہ اُسے تلاش کیا۔ چین اپنی دولت اور حُسن کے لیے اُسی طرح مشہور ہوگیا۔ کیلی فورنیا میں کانوں میں کام کرنے کے لیے مزدوروں کا ملنا مشکل تھا لیکن چین میں مزدوروں کی افراط تھی اور مزدوری کم تھی لہٰذا یہ لوگ کیلی فورنیا، پیرو اور کیوبا چلے گئے۔ یہ تھا قانون استثنائے مشرق[1] کی طرف پہلا قدم جو کئی سال بعد منسوخ ہوگیا۔

نانکنگ کے صلح نامے سے کوئی فریق بھی مطمئن نہیں ہُوا۔ چینیوں کو یہ خیال

---

[1] Oriental Exclusion Act

تھا کہ وہ بہت دب گئے ہیں اور غیر ملکی یہ سمجھتے تھے کہ انھیں کچھ نہیں ملا۔ یہ ایک طویل جنگ کا آغاز تھا۔ لڑائی کے بعد بیپنگ پر غیر ملکیوں نے قبضہ کر لیا تو کچھ اور صلح نامے ہوئے جن کے مطابق انھیں دس مزید بندرگاہوں پر وہی مراعات مل گئیں۔ تاجروں کو دریائے یانگ ٹسی پر اور سفیروں کو پیپنگ میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ غیر ملکی باشندے پاسپورٹ لے کر چین کے کسی بھی حصّے میں سفر کر سکتے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ آزادی سے کی جا سکتی تھی۔ الغرض جہاں کہیں چین مجبور ہو جاتا تھا وہاں بادلِ ناخواستہ غیر ملکی باشندوں کی شرائط منظور کر لیتا تھا البتّہ دو باتیں ہو کر رہیں۔ ایک یہ کہ عوام سفید فام اقوام سے نفرت کرنے لگے اور یہ نفرت ایک دن انتقام کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ دوسرے مغربی تعلیم اور خیالات نے چینیوں کے ذہن میں انقلاب برپا کر دیا اور اس طرح ایک نیا چین ظہور میں آیا۔

ان نتائج کے ظاہر ہونے سے پہلے چین میں ایک عجیب ہنگامہ برپا ہُوا جس کا سبب کچھ تو عیسائیت کا پرچار تھا اور کچھ اہلِ چین کی یہ خواہش تھی کہ وہ حکمراں منچو طبقے اور تمام اُمراء سے نجات پانا چاہتے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں سائی پینگ[1] بغاوت پھُوٹ پڑی جس کا سربراہ ایک کٹّر شخص تھا۔ اس کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا نے اُسے اِس کام پر مامور کیا ہے کہ وہ سب لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کرے، اُن سے خُدا کی پرستش کرائے اور امن کے قیام میں مدد دے۔ اِس تحریک نے زور پکڑا اور وہ ایک قسم کی معاشرتی و اقتصادی بغاوت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ کینٹن سے ورچنگ اور پھر نانکنگ تک پھیل گئی۔ یہ شہر دس سال تک سائی پینگ دارالخلافہ رہا۔ اب چین کی ایک مشہور خاتون سامنے آئی یعنی بیوہ ملکہ زاؤسی[2] جسے اکثر بوڑھا بودھ کہہ کر پکارا جاتا

---

[1] T'ai P'ing

[2] Tz'u Hsi

ہے۔ اصل میں وہ اپنی بھاوج کے ساتھ ولی یا مشیر کے فرائض انجام دیتی تھی۔ کیوں کہ شہنشاہ ابھی بچّہ تھا۔ یہ عورت متشدّد اور قابل تھی۔ اِس لیے اُس نے جلد ہی اقتدار حاصل کر لیا۔ اُس کے مجسّموں سے ظاہر ہے کہ وہ حسین اور شاہانہ شان و شوکت والی خاتون تھی۔ وہ منچو طرز کا عمدہ لباس اور سر پر چھوٹا تاج پہنتی تھی۔ اُس کے چہرے سے اُس کی ذہانت و لیاقت ہویدا ہے لیکن ساتھ ساتھ وہ توہم پرست اور ضدی بھی تھی۔ مغرب کے خلاف چین کی طویل کش مکش میں اُس کا کردار ڈرامائی حیثیت رکھتا ہے۔

سائی پینگوں نے اُس وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے، جب تک زاؤسی نے ایک غیر معمولی چینی شخص سینگ کوفان[1] اور برطانوی چارلس جارج گورڈن جسے چینی گورڈن کہا جاتا ہے، کی سرکردگی میں فوج روانہ نہ کی۔ بڑے بڑے کتب خانے جلا دیے گئے۔ علماء فضلاء کی پناہ گاہیں تباہ کر دی گئیں۔ اِس ابتدائی بغاوت نے دریائے یانگ ٹسی کی وادی کو تہہ و بالا کر دیا۔

بغاوت فرو ہونے کے کئی سال بعد تک امن و امان قائم رہا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زاؤسی نے معاملات پر قابو پانے کے لیے سختی سے کام لیا تھا، اور کچھ اہلِ مغرب نیز چینیوں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ اگر وہ تسلیم کردہ شرائط پر عمل کریں گے تو دونوں کے لیے اچھا رہے گا، لیکن زاؤسی اور اس کے رہنماؤں کو ایک خطرہ نظر نہ آ سکا اور وہ یہ کہ سائی پینگ بغاوت اصل میں اِس امر کی جانب اشارہ کر رہی تھی کہ چین میں تغیّر کا وقت آ گیا تھا۔ اہلِ مغرب اپنے ساتھ نئے خیالات لائے۔ چین میں ہزاروں سال سے جو جمہوریت چلی آ رہی تھی وہ اب پُرانی ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ عوام نے ایک نئے طرزِ حکومت کی مانگ کی۔

---

[1] Tseng-Kuo-Fan

اگر چین کی حکومت خود صحیح وقت پر اس تبدیلی کو قبول کر لیتی تو شاید اتنی خرابی پیدا نہ ہوتی۔ روبرٹ ہارٹ نامی ایک قابل شخص کی سرکردگی میں چائینیز میری ٹائم کسٹمز[1] کے نام سے ایک جماعت کام کر رہی تھی، جو پوری قوم کے کاروباری مفاد پر نظر رکھتی تھی۔ یہ جماعت چینیوں اور اہلِ مغرب کے باہمی اتحاد کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ اس کے علاوہ چینی باشندے دوسری اقوام کے باشندوں کو بھی برابر کے حقوق دے رہے تھے جو اب پیپنگ میں مقیم تھے۔ امریکی وزیر اینسن برلنگیم نے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے چینی سفیروں کو دوسرے ممالک میں بھیجنے کا انتظام کیا لیکن اُس کی بے وقت موت نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ امریکہ میں چینی مزدوروں کے داخلے کی وجہ سے بھی دقت پیدا ہو رہی تھی جس نے بعد میں نسلی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ غیر ملکی قوتیں اکثر اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کرتی تھیں، جس پر چینی حکام ناراض ہو جاتے تھے۔ اس اثنا میں مذہبی مبلّغین چینی نوجوانوں کو جدید جمہوریت کی بھی تعلیم دیتے رہے۔ ریلوے لائنیں بنیں، دریائے یانگ ٹسی پر نئی جہازی کمپنیاں قائم ہوئیں، تار گھر بنے اور کوئلے کی کانیں شروع ہوئیں۔ اِن سب کا نتیجہ یہ ہُوا کہ چینیوں میں بیداری کی لہر دوڑ گئی۔

اس کے برعکس جاپان نے مغرب کا اثر زیادہ تیزی سے قبول کیا کیونکہ وہ ایک چھوٹا اور متحد ملک تھا۔ وہاں صنعت و حرفت نے تیزی سے ترقی کی۔ جاپان کی یہ ترقی، اُس کا تشدّد اور کوریا نیز دوسرے قریبی جزائر پر اس کی حریصانہ نظر جنگ کا سبب بنی۔ ۱۸۹۴ء میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ چھڑ گئی جس میں چین کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شمونوسیکی کے صلح نامے کے مطابق چین کو کوریا

---

[1] Chinese Maritime Customs

سے مکمل طور پر دست بردار ہونا پڑا۔ اپنی چار بندرگاہوں پر جاپان کو کچھ حقوق دینے پڑے اور چین میں مقیم جاپانیوں کو وہی مراعات دینی پڑیں جو اہلِ مغرب کو حاصل تھیں۔
جاپان کی اس کامیابی کا مطلب یہ تھا کہ اب کوئی بھی غیر ملکی قوّت چین میں اپنی مرضی کے مطابق حقوق حاصل کر سکتی تھی۔ بیرونی قوّتوں نے یہ سوچا کہ جاپان کو بہت زیادہ مراعات مل گئی ہیں، لہٰذا اُس سے کچھ حصّہ لینا چاہیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب چین غیروں کے درمیان بٹ کر رہ جائے گا! ہر مرتبہ غالب قوّت نے اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق مراعات حاصل کر لیں۔ دوسری قوّتوں کو یہ بات ناگوار گذری اور اِس طرح کش مکش کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی گئی۔ ہر قوم چاہتی تھی کہ اُسے زیادہ سے زیادہ علاقہ، ریلوے مراعات، بندرگاہیں اور دوسری سہولتیں مل جائیں۔

جب حالات بدترین ہو گئے تو چین کو بچانے کے تین مختلف طریقے آزمائے گئے۔ اوّل یہ کہ بیرونی قوّتوں میں پھوٹ پڑ جائے۔ جب اِن قوّتوں نے یہ دیکھا کہ باہمی نفاق سے سب کو نقصان پہنچے گا تو سب نے متفق و متحّد رہنے کا فیصلہ کر لیا یعنی سب کا مفاد مشترکہ ہو گیا۔ اُنھیں چین کو بچانے سے اُتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی اپنی اغراض سے تھی۔ الغرض چین کے دروازے تمام اقوام کے لیے یکساں طور پر کُھل گئے۔ اِس معاہدے میں امریکا پیش پیش تھا۔ سیکرٹری آف سٹیٹ جون ہے نے تمام اقوام سے یہ وعدہ لیا کہ وہ ایک دوسرے کے مفاد کی حفاظت کریں گے۔

اہلِ چین نے اپنے ملک کو اقتصادی طور پر محفوظ رکھنے نیز قیامِ امن کے لیے دو مختلف طریقے استعمال کیے۔

کچھ لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ مُلک میں انقلاب ہو کر رہے گا۔ انھوں نے حکومت کی اصلاح کی کوشش کی۔ ان مصلحین میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ اُنھی میں ایک

نوجوان سن یاٹ سین بھی تھا۔ اُس نے منچو حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی لیکن ناکامیاب رہا اور موت سے بال بال بچا۔ اُسے ملک چھوڑ دینا پڑا اور جب وہ واپس آیا تو لوگ اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

ان مصلحین کو محسوس ہُوا کہ شہنشاہ، جس پر بیوہ ملکہ زاؤسی کی کڑی نظر رہتی تھی، انقلاب کا حامی تھا۔ اُس نے اجازت دے دی کہ سَو دِن تک اصلاح کی جائے۔ یہ اصلاحات بڑی نرم قسم کی تھیں لیکن مخالف قوتیں متحد ہو گئیں۔ بیوہ ملکہ کو بھی معلوم ہو گیا کہ نوجوان شہنشاہ بڑی حد تک خود مختار ہو گیا ہے۔ اُس نے اِن مصلحین کا خاتمہ کرنے کا تہیہ کر لیا اور بڑی بے دردی سے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک میں ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۰ء تک بغاوت ہوتی رہی جو بوکسر بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ زاؤسی نے باغیوں کو اجازت دے دی کہ وہ غیر ملکی باشندوں اور اُن کے حامیوں کو قتل کریں۔ سارے چین میں کشت و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ غیر ملکی افواج اپنے اپنے ہم وطنوں کو بچانے کے لیے آ جمع ہوئیں۔ جلد ہی پیپنگ اور ٹینٹسن محاصرے میں لے لیے گئے۔ کچھ سفید فام لوگوں نے بھاگ کر شنگھائی میں پناہ لی۔ غیر ملکی افواج نے پیپنگ پر یلغار کی تو چینی حکّام کو بھاگنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ چین کے حالات بد سے بدتر ہوتے رہے، کیونکہ انقلاب نیز قدامت پسندی دونوں ناکام ثابت ہوئے۔

چین کے تمام مدبّرین کو زاؤسی کی اِس پالیسی سے اتفاق نہیں تھا۔ کچھ کا خیال تھا کہ اُس کا یہ اقدام احمقانہ ہے۔ کچھ یہ سمجھتے تھے کہ کھُل کر لڑنا مناسب نہیں۔ لی ہنگ چنگ[1] ایک عظیم مدبّر تھا جو کسی سمجھوتے پر پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ امریکا نے دوسری اقوام کا غصّہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ چین پر غیر ملکی حکومت مسلّط

---

[1] Li Hung Chang

نہیں ہونی چاہیے۔

باکسر بغاوت کا فیصلہ چین کے لیے نہایت شرم ناک تھا۔ اس نے مقتول افسروں کے لیے معافی مانگی، جن شہروں میں غیر ملکی باشندے مارے گئے تھے، وہاں امتحاناتِ مقابلہ معطّل کر دیے گئے، اُن کی یادیں یادگاریں قائم کرانی پڑیں اور بہت کچھ مال و زر ہرجانے کے طور پر ادا کرنا پڑا۔ اب غیر مُلکی قوتوں نے چین کے دارالخلافے میں بڑی بڑی فوجیں رکھنی شروع کر دیں۔ اُن کی حیثیت فاتحین جیسی ہو گئی۔

چین کے حصّے بخرے نہیں ہوئے تھے، اس کی حکومت بھی قائم تھی لیکن کمزور اور مقروض۔ انقلاب کی ضرورت بدستور موجود تھی۔

ساتواں باب

انقلاب اور جمہوریہ

(۱۹۱۱ئہ تا ۱۹۳۱ئہ)

چین میں ہر سال ایک دن یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے جسے "دسویں مہینے کا دسواں دن" کہتے ہیں کیوں کہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۱ئہ کو وہ انقلاب آ کر رہا جو عرصۂ دراز سے متوقع تھا۔

اہلِ چین نے دیکھا کہ اُن کا مفاد اسی میں مضمر ہے کہ وہ اس تبدیلی کو خوش آمدید کہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ انقلاب پُرامن ہوگا، لیکن ریلوے لائنوں کی تعمیر کے لیے غیر ملکی قرضے کے سوال پر بغاوت ہو گئی جس نے انقلاب کی شکل اختیار کر لی۔ پھر یکایک ہانکو اور ووچنگ میں سپاہیوں نے اپنے کمانڈر لی یوان ہنگ کے خلاف بغاوت کر دی اور انقلاب میں شریک ہو گئے۔ چنانچہ ہانکو، ووچنگ اور ہان ینگ جو چین کے تین بڑے شہر اور دریائے یانگ ٹسی کے اہم بندرگاہ تھے، تیزی سے باغیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ پیپنگ نے یوان شی کوائی[1] کو فوج کا سربراہ مقرر کر کے حالات پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن بات بہت بڑھ چکی تھی۔ باغی یکے بعد دیگرے تمام شہروں پر قبضہ کرتے جا رہے تھے۔ بہت سے مقامات پر منچو افسروں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور لوگ اپنے تئیں قطعی خود مختار محسوس کرنے لگے۔

منچوؤں نے ہر جگہ بھاگ جانے یا چھُپنے کی کوشش کی لیکن چونکہ یہ لوگ صورت شکل

لے Yuan Shih K'ai

میں چینیوں سے قطعی مختلف تھے اس لیے آسانی سے پہچان لیے جاتے تھے۔ ان کی خواتین چینی عورتوں کی طرح چھوٹا کوٹ نہیں پہنتی تھیں بلکہ لمبے کپڑے پہنتی تھیں جو چین میں آج استعمال ہوتے ہیں۔ اُن کے پَیر بھی بندھے ہوئے نہیں ہوتے تھے۔ اگر کسی نے اپنے پَیر باندھنے اور لباس بدلنے کی کوشش بھی کی تب بھی کوئی فائدہ نہ ہُوا کیونکہ باغی حکومت کا تختہ اُلٹنے پر تُلے ہوئے تھے۔

سال ختم ہونے سے پہلے نانکنگ میں باغیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں ڈاکٹر سن یاٹ سین کو جمہوریہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ برسوں کے بعد ڈاکٹر سن کو سربراہ تسلیم کیا گیا۔ اُدھر پیپنگ میں یُوان شی کُوائی کو صدر منتخب کیا گیا۔ وہ لوگ ابھی تک مغلوب ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پھر نانکنگ اور پیپنگ کے درمیان مفاہمت ہوگئی اور لی یُوان ہنگ کو نائب صدر بنا دیا گیا۔

الغرض شہنشاہیت کا وہ دَور جسے شی ہوانگ ٹی اور بعد کے بادشاہوں نے تقویت بخشی تھی، ختم ہوگیا اور ملک میں ایک ایسی جدید جمہوریہ قائم ہوئی جس کی بقا معرضِ خطر میں تھی۔ ایک دقّت یہ تھی کہ یُوان شی کُوائی نے احتیاط کے پیشِ نظر پرانے طرزِ حکومت کو بڑی حد تک برقرار رکھا تھا لہٰذا اُس کے اور انتہا پسند لیڈروں کے درمیان تفرقہ پڑگیا۔

اُن کا یہ اندیشہ بجا تھا کہ یُوآن کے خیالات صحیح معنوں میں جمہوری نہیں تھے۔ نتیجہ جھگڑوں اور جنگوں کی صورت میں ظاہر ہُوا۔ حتّٰی کہ اُس نے ۱۹۱۵ء میں شہنشاہیت کو دوبارہ زندہ کر دیا اور خود شہنشاہ بن بیٹھا۔ اُسے مخالف افواج کی قوّت کا اندازہ نہیں تھا۔ سارے ملک میں بغاوت پھُوٹ پڑی۔ لہٰذا یُوان نے رسمِ تاج پوشی ملتوی کر دی۔ باغی اُسے معزول کرنے پر تُلے تھے لیکن اس کی علالت اور بعد میں اُس کی مَوت نے خود ہی یہ قِصّہ تمام کر دیا۔

اب نائب صدر لی یُوان ہنگ برسرِ اقتدار آیا لیکن وہ اس قدر کمزور تھا کہ حالات

کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ بدنظمی بڑھتی گئی اور نتیجہ یہ ہُوا کہ چین تقسیم ہو گیا۔ بیپنگ میں الگ حکومت قائم ہوئی اور کینٹن میں ایک اور حکومت کا قیام عمل میں آیا جس کے سربراہ ڈاکٹر سَن تھے۔ بیپنگ حکومت کمزور ہوتی گئی اور اس کے زعماء آپس میں ہی لڑنے لگے۔

یہ انقلاب ۱۹۱۱ء میں شروع ہُوا تھا۔ بارہ سال گزر جانے کے باوجود خانہ جنگیوں کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ عوام بدنظمی اور مسلسل خون خرابے سے تنگ آچکے تھے۔ جب چین پہلی جنگِ عظیم (۱۹۱۸ء) میں شریک ہو گیا تو اُس کے نوجوانوں کے انقلابی خیالات اور قوی ہو گئے۔ انھوں نے چین کو متحد کرنے اور بیرونی قوّتوں کو تمام مراعات سے محروم کر دینے کا تہیّہ کر لیا۔

ڈاکٹر سَن اِن انقلابیوں کے سربراہ تھے۔ یہ کمال بیں شخص ایک سوشل فلسفی اور عظیم طالب علم بھی تھا۔ اگرچہ اس کے بہت سے خیالات ناقابلِ عمل تھے لیکن اُس کی ذات میں کچھ ایسی کشش تھی کہ لوگ اس کی طرف کھنچتے تھے اور اس کے ہم خیال ہو جاتے تھے۔ اس میں پروپیگنڈا کرنے اور دوسروں میں تحریک پیدا کرنے کی زبردست صلاحیت موجود تھی لیکن وہ تنظیم سے بے بہرہ تھا۔ اُسے اکثر اپنے دارالخلافہ کینٹن سے باہر رہنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر سن یاٹ سین کا بیپنگ میں انتقال ہو گیا جبکہ وہ وہاں فوجی عمائدین سے مشورہ کرنے گئے ہوئے تھے۔ اب ملک میں کوئی سربراہ نہ رہا۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر سن کی موت سے چین اتنا متحد ہو جائے گا کہ ان کی زندگی میں بھی نہ تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جو منصوبے بنائے تھے انھیں اب عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔ انھوں نے روسیوں سے تنظیمِ حکومت میں مدد کی درخواست کی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ روسی حکومت عوام کی بڑی خیرخواہ ہے۔ وہ چین میں بھی یہی صورت چاہتے تھے۔ رُوسی مشیروں میں ایک شخص مائیکل بوروڈِن بھی شامل تھا۔ اُس کے مشورے سے

ڈاکٹر سن نے نیشلسٹ یعنی قوم پرست جماعت کا منصوبہ تیار کیا جو "کومنٹانگ[1] " کہلائی۔ ڈاکٹر سن نے جمہوری حکومت کے متعلق کئی کتابیں لکھی تھیں اور اپنے منصوبوں کی نشان دہی کی تھی۔ اُن کے مرنے کے بعد اُن کے منصوبے منظور کر لیے گئے۔ پورے ملک میں ہر ہفتے اُن کے حق میں دُعا کی جاتی تھی اور ان کی کتابیں اسکولوں کے نصاب میں شامل کر دی گئیں۔ ایک کتاب "سان من چو اوّل" پارٹی کا دستور العمل بن گئی۔ کینٹن کے قریب وھامپو کی ملٹری اکیڈیمی میں عسکری تربیت کے علاوہ پارٹی کے اصولوں اور طریقِ کار کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ الغرض چین اپنے عوام کے لیے بہتر حکومت، بہتر معاشرت اور خودمختاری حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

۱۹۲۶ء میں کومنٹانگ فوجیں چیانگ کائی شیک نامی ایک نوجوان جنرل کی سرکردگی میں بیپنگ کے خلاف شمال کی جانب بڑھنی شروع ہوئیں۔ وہ برق رفتاری کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ یانگ ٹسی وادی بغیر کسی مزاحمت کے اُس کے قبضے میں آ گئی۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ وہ موسمِ خزاں تک پیپنگ پہنچ جائے گا۔

اب خود اِس پارٹی میں نااتفاقی پیدا ہو گئی۔ کچھ انتہاپسند لیڈر ہانکو میں جمع ہوئے اور انھوں نے رُوس سے اپنا رابطہ زیادہ قوی کر لیا۔ چیانگ کائی شیک نرم رو انسان تھا۔ اس نے شنگھائی کے سرمایہ داروں سے ٹھیک اس وقت بات چیت شروع کر دی، جب ہانکو کے لیڈر یہ چلّا رہے تھے: "سرمایہ داروں کو معزول کرو!" جب سے اب تک بہت سے لوگوں کو یہ محسوس ہوا ہے کہ چیانگ نے انقلابیوں کے ساتھ غداری کی۔ ملک میں پھر دو دارالخلافے بن گئے اور وہ بھی قوم پرست علاقے میں ہی —— ایک ہانکو میں اور دوسرا نانکنگ میں۔

---

[1] Kuomintang

عوام انتہا پسندوں کے ان عزائم سے خوف زدہ ہو کر قدامت پسند ہو گئے۔ وہ چیانگ کے چاروں طرف جمع ہونے لگے اور ہانکو کی حکومت معزول ہو گئی۔ روسی مشیروں کو واپس بھیج دیا گیا۔ شنگھائی کے سرمایہ داروں نے نانکنگ کو مدد دینی شروع کر دی جس کا سربراہ چیانگ تھا۔ ۱۹۲۷ء میں چیانگ نے سونگ مائی لنگ[1] سے شادی کر لی جس کی ایک بہن وزیر صنعت، محنت اور تجارت ایچ۔ ایچ۔ کُنگ کی بیوی تھی اور جس کا بھائی ٹی۔ وی۔ سونگ وزیرِ مال تھا۔ اِس شادی سے چیانگ کے ہاتھ خوب مضبوط ہو گئے لیکن عوام نے کہنا شروع کر دیا کہ اب "سونگ" خاندان کی حکومت آ گئی ہے۔

ہانکو کی انتہا پسند حکومت سے جو لوگ جان بچا کر بھاگے، ان میں سونگ مائی لنگ کی ایک اور بہن بھی شامل تھی جس کا نام سونگ چنگ لنگ تھا۔ وہ ڈاکٹر سن یاٹ سین کی بیوہ تھی اور اپنے مرحوم شوہر اور اُن کی تحریک کی دلدادہ تھی۔ جب سے اب تک وہ اپنے عزائم سے کبھی نہیں ہٹی۔ جب بھی بولنے کی ضرورت ہوئی ہے وہ بولی ہے اور انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ جہاں کہیں اُس نے چیانگ کو غلطی پر دیکھا ہے وہاں اُسے ملزم گردانا ہے اور عوام کے مفاد کو ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔ وہ ایک خاموش طبع، منکسر مزاج خاتون ہے۔ اُسے اکثر خطرات کا سامنا رہا ہے۔ کبھی کبھی اُسے اپنا نام تک بدلنا پڑا لیکن اُس نے ہمیشہ چینی کمیونسٹوں کی مدد کی ہے جن کی وہ زبردست حامی ہے۔

۱۹۲۸ء میں چیانگ نے پھر شمال کا رخ کیا۔ بظاہر حکومت متحد ہو چکی تھی اور کمیونسٹ عنصر غائب ہو چکا تھا۔ شمال میں فنگ یوسانگ[2] اور ین سی شان[3] کی حامی فوجیں چیانگ کی حامی فوجوں سے مل گئیں اور پیپنگ میں داخل ہو گئیں۔

چین چیانگ کائی شیک کی سرکردگی میں متحد ہو گیا اور نانکنگ قوم پرست جماعت

---

[1] Soong Mie-Ling [2] Feng Yu- hsiang [3] Yen Hsi-shan

کا صدر مقام قرار پایا۔ پیکنگ کا نام پیپنگ پڑا۔ نئی حکومت میں مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کو اہم عہدے تفویض ہوئے اور قدیم و مشہور شہر نانکنگ کی ترقی کے لیے ایک عظیم منصوبہ تیار کیا گیا۔ ڈاکٹر سن کو قریبی نیلگوں پہاڑ پر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دفن کیا گیا اور وہاں ایک سادہ لیکن خوب صورت مقبرہ تعمیر کرایا گیا۔ اس موقعے پر میڈم سین بھی موجود تھیں لیکن اُن کا دل رو رہا تھا کہ لوگوں نے اُن کے مرحوم شوہر کی تعلیمات کو بظاہر تو قبول کر لیا تھا مگر بہ باطن بدل ڈالا تھا۔ انھوں نے منہ پر نقاب ڈالی ہوئی تھی اور چُپ چاپ اس جلوس میں شریک تھیں۔

نانکنگ کے لیے یہ عجیب زمانہ تھا۔ پُرانی تنگ سڑکیں فراخ کی گئیں۔ اِس مقصد کے لیے بہت سے مکانات مسمار کرنے پڑے۔ بہت سے گھرانے اپنا سامان لیے اِدھر اُدھر بیٹھے نظر آتے تھے۔ لوگ پریشان، دل شکستہ اور خوف زدہ تھے لیکن کینٹن میں جدت پیدا ہوئی۔ چاروں طرف شان دار سرکاری عمارتیں کھڑی ہوگئیں۔ پُرانی ٹُوٹی پھُوٹی گھوڑا گاڑیوں کی جگہ موٹر کاریں دوڑنے لگیں۔ جب کاریں پُرانے محلّوں سے آہستہ آہستہ گذرتی تھیں، تو بچے اُن کے پیچھے دوڑتے تھے اور سواری گانٹھتے تھے۔ غرض عجب ہنگامہ برپا تھا۔

نیا چین پیدا ہو چکا تھا ـــ جمہوریۂ چین ـــ لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا۔ تغیّر کے خواہاں لوگوں نے جوش میں یہ سمجھ لیا کہ انقلاب مکمّل ہو گیا ہے۔ دنیا نے بھی یہی سمجھا۔ اس وقت کوئی یہ نہ دیکھ سکا کہ انقلاب ابھی شروع ہُوا ہے کیونکہ انقلاب اُسی وقت آتا ہے جب لوگوں کی معاشرت بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پینتالیس کروڑ انسانوں کی زندگی سدھارنا آسان کام نہیں، خاص طور سے جبکہ وہ غریب بھی ہیں۔ ڈاکٹر سَن کو اِس بات کا احساس تھا۔ انھوں نے انقلاب کے متعلّق اپنی زبان اور قلم دونوں سے یہ بتایا تھا کہ اس کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کام میں کئی سال لگیں گے۔

آٹھواں باب

جاپانی حملہ

(۱۹۳۱ء - ۱۹۴۴ء)

چینیوں نے ۱۹۴۴ء میں ایک اور دن بھی یادگار کے طور پر منایا تھا لیکن دسویں مہینے کے دسویں دن سے قطعی مختلف انداز میں۔ ۱۹۳۷ء کے ٹھیک سات سال بعد ۷، جولائی ۱۹۳۷ء کو چین پر دوبارہ حملہ ہُوا۔

کہا جاتا ہے کہ مارکوپولو تیرھویں صدی میں ایک پُل کے ذریعے چین میں داخل ہُوا تھا۔ اس پُل کے منہ پر پتھر کے دو شیر بنے ہوئے ہیں۔ عرصۂ دراز سے وہ مارکوپولو پُل کے نام سے مشہور چلا آتا ہے۔ اب یہی جگہ جاپان کے لیے حملے کرنے کا ایک بہانہ بن گئی۔

ہزاروں سال گذرے جاپانیوں نے جنھیں اہلِ چین "مشرقی سمندر کے لوگ" کہتے ہیں، چینیوں سے لکھنا، تصویر کشی، فنِ تعمیر اور بُدھ مت کے اصول سیکھے تھے۔ وہ چینیوں کی عزت اسی وجہ سے کرتے تھے۔ جاپان کی قابل ترین شخصیتیں چین کے مشہور شہروں میں تحصیلِ علم کے لیے پہنچتی تھیں۔ اسی مُلک سے جاپانیوں نے ریشم سازی کا راز اور تصاویر وغیرہ کے بلاک بنانے کا فن سیکھا۔ چینیوں نے ہی انھیں یہ بتایا کہ باغات میں رکھے ہوئے پتھر لگانے سے کس قدر خوب صورتی پیدا ہو جاتی ہے۔

وقتاً فوقتاً جاپانی بحری قزاق چین کے ساحل پر ڈاکے ڈالتے رہے اور اپنے ساتھ دولت و زرومال لے جاتے تھے۔ جب کموڈور پیری نے جاپان کے دروازے باقی دنیا پر

کھول دیے تو انھیں مغربی طور طریقے سیکھنے کا خیال آیا اور یہ کام انھوں نے بڑی تیزی سے کرلیا۔ انھوں نے اپنے ملک میں صنعت و حرفت کو فروغ دیا اور مغرب سے جدید طریقِ جنگ سیکھے۔ ۱۸۷۱ء میں جاپان نے جزائر لیوچیو[1] اپنے قبضے میں کرلینے کا تہیّہ کرلیا، جو چین کی ملکیت تھے۔ اِن جزائر کے قدیم باشندوں نے فارموسا میں کچھ چینیوں کو قتل کردیا۔ جاپان نے اِس واقعے کی ذمّہ داری چین پر دھری اور وہاں اپنی فوج بھیج دی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ فارموسا کا کچھ حِصّہ نیز جزائر لیوچیو جاپان کے قبضے میں آ گئے۔ پھر اُس کی حریفانہ نظریں کوریا پر پڑنے لگیں جس کی وہ مُدّت سے تمنّا کر رہا تھا اور جہاں اس سے قبل بھی وہ چین کے حقوق تلف کرنے کی کوشش کرچکا تھا۔ کوریا کے سوال پر ۱۸۹۴ء میں چین اور جاپان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ بالآخر چین کو شمونوسیکی[2] کے صلح نامے پر دستخط کرنے پڑے، جس کے مطابق کوریا کو برائے نام آزادی مل گئی لیکن حقیقت میں وہ جاپان کے قبضے میں چلا گیا۔ اِس کی رُو سے جاپان اپنے پُرانے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

۱۸۹۹ء میں بوکسر بغاوت نے چین کے ٹکڑے کردیے اور وہ کمزور ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی جاپان اور روس نے منچوریا پر قبضہ کرلیا۔ غیر ملکی قوّتیں چین کو پارہ پارہ کرنے پر تُلی تھیں۔ لڑائی ہوئی تو جاپان کو جنوبی منچوریا میں قدم ٹکانے کی جگہ مل گئی۔ اُس نے کوریا میں اپنی قوّت بڑھائی اور جزیرہ نما لیاؤتنگ[3] میں بھی۔ الغرض جاپان چین کے مرکزی حصّے تک پہنچتا جا رہا تھا۔

معاہدوں کے باوجود کہ منچوریا میں آزادانہ پالیسی پر عمل کیا جائے گا، جاپان اور دوسری قوّتیں اپنے وعدوں سے پھر گئیں۔ غیر ملکی قرضوں کی وجہ سے منچوریا اور مغربی چین میں ریلوے لائن تعمیر کرنے کا معاملہ پیچیدہ ہو گیا۔ بیرونی قوّتوں کو اِن قرضوں کی وجہ سے یہاں

---

[1] Lin Ch'in islands [2] Shimonoseki [3] Liaotung Peninsula

زیادہ سے زیادہ اقتدار حاصل ہوتا رہا۔

اِن وجوہ کی بناء پر چین اور بیرونی ملکوں کے درمیان جنگ اور صلح ناموں کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک مرتبہ تو ایسا معلوم ہُوا کہ اب چین اور جاپان میں شدید لڑائی چھڑ جائے گی۔ لیکن ۱۹۱۸ء کی لڑائی کی وجہ سے مغربی قوّتیں مشرقِ بعید کے معاملات سے کم و بیش دست بردار ہو گئیں اور جاپان کے تشدّد میں اضافہ ہو گیا۔

۱۹۳۱ء میں عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ جاپان کی آبادی بڑھ چکی تھی۔ وہ منچوریا میں اپنے کچھ باشندے آباد کرنا چاہتا تھا اور اس کے وسائل سے بھی فائدہ اٹھانے کا آرزومند تھا۔ اس کے علاوہ جاپان رُوس سے خوف زدہ رہتا تھا۔ جاپانی فوجی زعما جو اصل میں حکومت پر قابض تھے، یہ محسوس کرنے لگے کہ ایشیا اہلِ ایشیا کا ہے اور جاپان کو خُدا نے اِس برّاعظم کا لیڈر بنایا ہے۔ اہلِ کوریا اور جاپانیوں کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا تو جاپانی فوجوں نے منچوریا پر قبضہ کر لیا۔ ایک سال بعد وہاں بظاہر چین کا اقتدار آگیا لیکن اصل میں وہ جاپان ہی کے قبضے میں رہا۔

اس کے ایک سال بعد جاپان اور منچوریا کی فوجوں نے ہمسایہ صوبے جہول پر حملہ کر دیا، جو منگولیا کا ایک حصّہ تھا اور چند ہی ہفتوں میں اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

چینیوں کو جاپان کی اِس حرکت پر بہت غُصّہ آیا اور اُنھوں نے جاپانی مال کا بائیکاٹ کر دیا۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی جہاں کے لوگوں کو حالات کا صحیح علم نہیں تھا، بہت سا جاپانی مال جلا دیا گیا اور جن دوکانداروں نے تعاون نہیں کیا، اُنھیں سخت سزائیں ملیں۔ شنگھائی میں اس کا شدید ترین ردِّعمل ہُوا کیونکہ وہاں جاپانیوں کی تعداد، اُن کی تجارت اور صنعت سب سے زیادہ تھی۔ الغرض لڑائی چھڑ گئی اور کئی مہینے جاری رہی۔

چونکہ چین اور جاپان دونوں لیگ آف نیشنز کے رُکن تھے اور جاپان صلح نامے کے

مطابق چین کے حقوق کا احترام کرنے کا پابند تھا۔ اس لیے بیرونی دنیا نے بھی ان معاملات میں تشویش کا اظہار کیا۔ جاپان نے لیگ سے مدد کی درخواست کی اور لارڈ لٹن نے تحقیقِ حال کے لیے ایک بین الاقوامی کمیشن مقرر کردیا۔ اس رپورٹ سے کوئی فریق بھی مطمئن نہ ہو سکا اور جاپان نے لیگ آف نیشنز سے علیٰحدگی کا اعلان کر دیا۔

۱۹۳۷ء میں وہ دن آگیا جس کا جاپان کو انتظار تھا۔ اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ مشرقِ بعید کو بدنظمی و تباہی سے بچانا چاہتا ہے اور چین پر چڑھ دوڑا، لیکن اس مرتبہ قوم پرست کافی تیار تھے۔ بیرونی تجارت بہتر پیمانے پر ہو رہی تھی۔ شمالی اور جنوبی ریلوے ٹھیک کام کر رہی تھی۔ کمیونسٹوں کے مسئلے کے باوجود چین اس مسئلے سے عہدہ برآ ہو جاتا، بشرطیکہ اُسے کچھ وقت مل جاتا۔ اگر لیگ آف نیشنز اُس کی مدد کرتی تو معاملہ اور آسان ہو جاتا لیکن یہ مدد ممکن نہ ہو سکی۔ سب سے پہلے جاپان نے چین پر حملہ کیا۔ اٹلی حبشہ میں

گھس گیا۔ اٹلی پر فاشزم مسلط ہو گیا۔ جرمنی میں ہٹلر نے سر اٹھایا اور زیکوسلوکیہ دھوکے کا شکار ہُوا۔ بیرونی ممالک چین کو بچانے کے لیے کوئی قربانی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جاپان جیسے جیسے قوّت حاصل کرتا رہا، یہ ممالک اُس کے ساتھ اپنی تجارت بڑھاتے رہے۔ چین کے شمال مشرقی حصّے "مانچوکو" کی کسی مغربی طاقت کو مطلق فکر نہ تھی۔ وہ اس حصّے کو خود مختار تسلیم نہیں کرتے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاپان کے تسلّط میں چلا گیا۔

جاپان کے ساتھ چین کی لڑائی اصل میں ۱۹۳۱ء میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ جب جاپان نے منچوریا اور جہول پر قبضہ کیا تھا۔ اب جاپان نے یہ مطالبہ کیا کہ دوسرے شمالی صوبے مثلاً ہوپہ، شانسی، سوئیان اور شانٹنگ وغیرہ رہیں تو چین کے قبضے میں ہی لیکن ان پر ایسے حکمراں متعین کیے جائیں جو جاپان کو بھی تسلیم ہوں۔ ان صوبوں کے کچھ باشندے متزلزل ہو گئے لیکن جنوبی علاقے کا اتحاد بڑھتا رہا۔

یہی بات جنگ کا بہانہ بن گئی۔ کمیونسٹ دریائے یانگ ٹسی کے جنوب میں جمع ہو گئے

تھے۔ قوم پرست فوجیں اُن کی سرکوبی کر رہی تھیں۔ کمیونسٹوں نے اپنا راستہ بدل کر شنسی کے شمالی صوبے میں پناہ لی لیکن ۱۹۳۶ء تک بہت سے چینی لیڈروں کو اس امر کا احساس ہو گیا تھا کہ کمیونسٹوں کی سرکوبی اتنی ضروری نہیں ہے جتنی جاپانیوں کی ہے۔ اس احساس میں خود کمیونسٹ بھی شریک تھے اور وہ قوم پرست فوجوں کے ساتھ مل کر لڑنا چاہتے تھے۔

اب سوائے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ چیانگ کائی شیک کو کمیونسٹوں کے ساتھ تعاون کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اُس کی اپنی فوجیں چانگ سوہ لیانگ[1] کی سرکردگی میں شمالی سرحد پر باغی ہو چکی تھیں۔ یہ علاقہ کمیونسٹ علاقے سے ملا ہُوا تھا۔

چیانگ کائی شیک صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ہوائی جہاز سے سیان پہنچے، جو شنسی میں ہے۔ وہاں انھیں فوراً قید کر دیا گیا۔ خطرہ شدید تھا کیونکہ سرکاری فوجیں بھی باغی ہو چکی تھیں، کمیونسٹ الگ برہم تھے اور کچھ مقامی فوجیں بھی موجود تھیں، لیکن ایک کو دوسرے پر مطلق اعتماد نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چیانگ کا وقت آ گیا ہے۔ سب نے منع کیا لیکن میڈم چیانگ نہ مانیں، وہ بھی اُڑ کر اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئیں۔ اور اُنھیں مائل بہ مصالحت کرنے لگیں۔

جب کوئی صورت نہ نکلی تو ایک کمیونسٹ لیڈر نے ثالثی کی کوشش کی۔ خلافِ توقع چیانگ غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے۔ چانگ سوہ لیانگ نے اپنے تئیں اُن کے سپرد کر دیا اور باغی کی حیثیت سے اُن کے ساتھ ہوائی جہاز کے ذریعے واپس پہنچ گیا۔ اہلِ مُلک خوشی سے دیوانے ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کمیونسٹ اور قوم پرست مل کر جاپان سے لڑیں گے۔

اس اتحاد کا جاپان کو بھی علم ہو گیا۔ وہ چین کو پارہ پارہ کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں

---

[1] Chang Hsiieh liang

مارکو پولو پل والا واقعہ رونما ہو گیا۔ جاپان کو اپنی منصوبہ بندی پر مکمل اعتماد تھا۔ اُسے چین کے عام سپاہی کا کوئی خیال نہیں تھا کیونکہ وہ آسانی سے خریدا جا سکتا تھا۔

جاپان کی یہ توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ چینی سپاہی غصّے میں بھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مزاحمت کی اور لڑائی شروع ہو گئی۔ جاپانیوں نے اپنی توپیں اور مشین گنیں پہلے ہی درست کر لی تھیں، اُن کے ہوائی جہاز اُڑنے کو تیار کھڑے تھے۔ لڑائی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی لیکن بد نظمی کی وجہ سے شمالی چین دُشمن کے چنگل سے نہ بچ سکا۔ اتنا فائدہ ضرور ہُوا کہ جاپانی فوجوں کو جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے میں ہفتے اور مہینے لگ گئے۔

جاپان کا خیال تھا کہ آپس میں صلح ہو جائے گی۔ اُس نے دریائے یانگ ٹسی کی وادی سے اپنے تمام مرکز صاف کر دیے۔ چینی باشندے مفاہمت کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ اپنی آزادی کی خاطر جان دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ جاپانی بحریہ شنگھائی کے قریب آ گیا اور شہر پر گولہ باری شروع کر دی۔ یہاں چینیوں نے ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ دُنیا حیران رہ گئی، تاہم جاپانی بحری فوج اور ساز و سامان چینی سپاہیوں کے مقابلے میں کہیں بہتر تھا۔ گھر گھر لڑائی ہوئی اور بالآخر چین کے بہادر سپاہیوں کو پسپا ہونا پڑا یا جان سے گئے۔ جاپان نے دارالخلافہ نانکنگ کا رُخ کیا اور وہاں ایک ایسا واقعہ رونما ہُوا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ طویل جنگ شروع ہو گئی۔

چینی حکومت پہلے ہانکو میں اور پھر اندرونِ ملک چنگ کنگ میں منتقل ہو گئی۔ حکومت کے ساتھ ساتھ عوام بھی منتقل ہوئے۔ انتقالِ آبادی کی یہ ایک اہم تاریخی مثال ہے۔ سکول اور کالج تک جانبِ مغرب روانہ ہو گئے۔ بہت سے لوگ پیدل چل پڑے۔ کچھ کشتیوں پر، کچھ رکشاؤں میں، گاڑیوں میں، کاروں میں اور بعض اساتذہ نے راستے میں بھی درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ بہت سے گھرانے اسی صورت "آزاد چین" کی جانب روانہ

ہو گئے۔ جاپانیوں نے جہاں کہیں قدم جمانے کی کوشش کی، گوریلا سپاہیوں نے اُن کی جان مصیبت میں ڈال دی۔ شدّتِ نفرت سے جنگ بھی شدید تر ہو گئی۔

اس کے باوجود چین کا بہترین حِصّہ جاپان کے قبضے میں رہا۔ زیادہ تر صنعتی کارخانے کوئلے کی کانیں، بہترین زرعی علاقہ اور تقریباً تمام ریلوے لائنیں جاپان کے اقتدار میں آ گئیں۔ چین کے پاس اتنا سازو سامان نہیں تھا کہ وہ کُھل کر میدانِ جنگ میں جاپان کا مقابلہ کرتا۔ تھوڑی بہت مزاحمت جاری رہی اور چین سمندر اور بیرونی دُنیا سے کٹتا گیا۔ دُشمن نے اُس کا محاصرہ کر لیا۔ بیرونی دنیا سے اُس کا تعلّق صرف برما روڈ اور رُوس کو جانے والی سڑک کے ذریعے باقی رہ گیا۔ لیکن پٹرول کی کمی اور موٹر گاڑیوں کی خرابی کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آئی۔ امریکا سے آنے والی رسد کی رفتار بیحد سُست تھی۔

چنگ کنگ کے نواحی علاقے زیچوان کی آبادی کے علاوہ اُن ہزاروں آدمیوں کی غذا کا سوال اہم تھا جو یہاں پناہ حاصل کرنے کے لیے چلے آ رہے تھے۔ چنگ کنگ پر بار بار گولہ باری ہو رہی تھی۔ اُس سے بچنے کے لیے پہاڑ میں پناہ گاہیں تراشی گئیں۔ تباہ شدہ عمارتوں کی جگہ نئی لیکن نازک عمارتیں آن کی آن میں کھڑی کر دی جاتی تھیں۔

مسٹر ریوی ایلے نے جو عرصۂ دراز سے چین میں مقیم تھے، اُن ذرائع پر غور کرنا شروع کیا جن کی مدد سے محاصرے میں پھنسے ہوئے یہ چینی باشندے اپنی بقا کا سامان پیدا کر سکیں۔ دوسرے لوگ بھی اُس کے ساتھ ہو گئے۔ اتحادِ باہمی کے تحت چھوٹے چھوٹے کارخانے شروع کیے گئے۔ روپے کی کمی تھی لیکن ہر پیشے اور صنعت کے بہت سے لوگ ضرور موجود تھے۔ سات آدمی مل کر ایک چھوٹا سا کارخانہ شروع کر سکتے تھے۔ مثلاً سات لوہار۔ وہ ایک مرکزی انجمن سے کچھ روپیہ قرض لے سکتے تھے اور اپنی مہارت سے کُدالیں، پھاوڑے اور دوسری ایسی ہی چیزیں تیار کر سکتے تھے۔ اِس طرح

جو آمدنی ہوتی تھی اس کا کچھ حصّہ وہ انجمن کو واپس کر دیتے تھے، کچھ اپنے کارخانے میں لگا دیتے تھے اور کچھ خود کھاتے تھے۔ اِس طرح سرمایہ بڑھتا رہا اور دوسرے لوگوں نے اِس سے فائدہ اُٹھایا۔

بہت سی چھوٹی چھوٹی دوکانیں کُھل گئیں جن میں ہر شخص اپنے پیشے اور تجربے کے مطابق بندوقوں، مشینوں، چھاپہ خانوں، صابن سازی، پارچہ بافی اور بڑھئی کے اوزار تیار کرنے لگا۔ سب سے پہلے چینی حکومت نے فوج کے لیے دس لاکھ اُونی کمبل خریدنے کا اعلان کیا۔ جنگ کے آغاز میں بہت سے زخمی سپاہی سردی سے اکڑ کر مر گئے تھے کیونکہ اُن کے پاس سُوتی کمبل تھے۔ اِس مانگ کو پُورا کرنے کے لیے ہزاروں تارکشوں کی تربیت کا سوال پیدا ہُوا، ساڑھے سات ہزار نئے کرگھے تیار ہوتے تھے اور ساڑھے سات سَو دستی کرگھوں کی ضرورت تھی۔ ان کرگھوں کے لیے المونیم کی ضروری مقدار اُن جاپانی طیاروں سے حاصل کی گئی جنھیں مار گرا لیا گیا تھا۔ بہت سی مشکلات کے باوجود یہ کمبل وقت پر تیار ہو گئے۔ لوگوں نے متحدّ ہو کر ۱۹۴۲ء کے آخر تک تیس لاکھ کمبل بُن ڈالے۔

اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس کام میں مصروف رہے کیونکہ اس وقت چین کو چند ضروری اشیاء درکار تھیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے کارخانے پُرانے مندروں، خفیہ مقامات، گہری گھاٹیوں اور گھروں میں پوشیدہ رکھے گئے اور ایسا انتظام کیا گیا کہ اگر حملہ ہو تو انھیں فوراً ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے۔

ان کارخانوں نے ۱۹۴۴ء میں ڈھائی سَو سے زیادہ اقسام کی چیزیں تیار کیں۔ اِس قسم کی دو ہزار اتحادی انجمنیں کام کر رہی تھیں جن کے ارکان کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی۔ اسی نہج پر شفاخانے، دارالاطفال اور بینک بھی قائم کیے گئے۔ چاروں طرف سے ایک ہی آواز آتی تھی "گنگ ہو!" "مل کر کام کرو!"

جب دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کیا تو اہلِ چین کو امید کی نئی کرن نظر آئی۔ وہ عرصۂ دراز سے یہ سمجھ رہے تھے کہ جاپان میں وہی عسکری روح بیدار ہو چکی ہے جو جرمنی کو آمادۂ جنگ کیے ہوئے ہے اور یہ کہ جاپان اپنے مشرقی مفادات کی خاطر مغربی قوتوں سے لڑنے کے لیے تیار ہے۔ مغرب کو اس بات کا یقین نہیں آتا تھا لیکن چین کا خیال درست تھا۔ اب تمام جمہوری ممالک مشرق میں جمہوریت بحال کرنے کے لیے متحد ہو چکے تھے۔ اب مدد کا آنا یقینی ہو گیا تھا۔

چین تک یہ امداد بڑی دیر سے پہنچی۔ ہندوستان میں برما روڈ کے آخری سرے پر سامانِ رسد جمع ہوتا جا رہا تھا لیکن اُسے چین میں تیزی سے نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔ جاپان بڑھتا آ رہا تھا۔ ہانگ کانگ مغلوب ہو چکا تھا، فلپائن، ملایا، جزائر شرق الہند، رنگون اور پھر برما بھی فتح ہو گیا۔ سامانِ رسد گم ہو گیا اور چین کا یہ آخری دروازہ بھی بند ہو گیا۔ صرف رُوس کو جانے والی سڑک باقی رہ گئی۔

امریکی امداد کی رفتار سست رہی۔ پرل ہاربر کے حملے کے وقت جو چینی ہوا باز زیرِ تربیت تھے، وہ جنرل چینولٹ[1] کی سرکردگی میں چودھویں ہوائی دستے میں شامل ہو گئے اور انھوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ بہت سے ہوائی جہاز چین اور ہندوستان کے درمیان بلند و خطرناک پہاڑوں کو پار کر کے سامانِ رسد لانے لگے۔

اِن تمام مشکلات کے باوجود چین نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ سات سال تک تنِ تنہا شہنشاہیت کے خلاف نبرد آزما رہا تھا اور زندہ تھا۔ اُس کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے، وہ محاصرے میں تھا، لیکن اب بھی برسرِ پیکار تھا۔ تاریخ نے ایسے واقعات پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ غالباً اہلِ جاپان اِس ملک کے لوگوں کو اچھی طرح پہچان نہیں سکے

---

[1] General Chennualt

تھے ۔ شاید انھیں اندازہ نہیں تھا کہ انسان کو اپنی آزادی کس درجہ عزیز ہوتی ہے۔ سپاہی اور قُلی اپنا اپنا کام کرتے ہوئے صرف ایک ہی جنگی گیت گاتے تھے۔ "چین پھر اُٹھے گا!" جس شخص نے بھی ان کی تاریخ پڑھی ہے یا اُن سے واقف ہے، وہ اِس بات کو درست سمجھتا ہے۔ تاہم یہ سوال ہنوز تشنۂ جواب ہے کہ کیا یہ بیداری کمیونسٹ نظام کے تحت ممکن ہے ——— عوامی جمہوریۂ چین۔

نواں باب

چین اور رُوس

چین کی دلکشی اور اُس کی طویل و مسلسل تاریخ کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ گھریلو زندگی کے دلدادہ رہے ہیں۔ اُس کے فلسفیوں نے ہمیشہ یہی درس دیا کہ قوم کی مثال ایک گھرانے جیسی ہے۔ بچوں کو سکولوں میں یہ پڑھایا جاتا تھا کہ لوگوں کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیے اور گھر میں اتفاق و یک جہتی پر زور دیا جاتا تھا۔
چین کی طویل قومی تاریخ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اُس نے آزادی کو ہمیشہ عزیز رکھا ہے۔ حکومت نے لوگوں کو بہت کم اپنا غلام بنایا ہے۔ بعض اوقات تو عوام کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُن کے سر پر کوئی حکومت بھی ہے۔ دیہاتی باشندوں کا تعلق صرف اپنی کونسلوں اور مجسٹریٹوں سے ہوتا تھا۔ کنفوشیس کے ایک ہم عصر فلسفی منیکس کا قول ہے "جب کوئی فرمانروا اپنی رعایا کو گھاس اور کیچڑ سمجھنے لگے تو عوام کو اُسے قزاق اور اپنا دُشمن سمجھنا چاہیے۔" اگرچہ یہ بات اب سے ڈھائی ہزار سال پہلے کہی گئی تھی تاہم وہ امریکا کے اعلانِ آزادی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چین میں بادشاہ کو کبھی بھی رحمانی حقوق حاصل نہیں تھے۔ قدیم زمانے میں بھی شہنشاہ کو عوام کا خادم سمجھا جاتا تھا اور اگر وہ عوام کی خدمت سے گریز کرتا تھا تو سب اُس کے مخالف ہو جاتے تھے۔

چینیوں کے یہ قدیم خیالات تبدیل ہو کر مغربی خیالات سے مل گئے اور اسی طرح ڈاکٹر سن یات سین کی سرکردگی میں حکومت تبدیل ہوئی۔ انہی خیالات کی بدولت چینی باشندے جاپانی حملوں کے وقت متحد رہے۔ انھوں نے جاپانیوں کی حکومت قبول

کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ وہ بھی ایشیا ہی کی ایک قوم ہے۔ بالآخر جب مغرب نے چینیوں کی مدد کی تو انھوں نے نئے عزائم کے ساتھ اپنے مسلک کو دُہرایا کہ وہ کسی دوسری قوم کے غلام نہیں بنیں گے۔

طویل جنگوں نے چینیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ انھوں نے نیز اُن کے ہمسایہ ممالک نے امداد اور سربراہی کے لیے امریکا کی طرف دیکھا۔ یقیناً مستقبل اُن کے ہاتھ تھا جو جمہوریت کے حامی تھے اور جنھوں نے آزادی کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ مغربی طاقتوں نے جن ملکوں کو اپنی نوآبادی بنایا ہُوا تھا، اُن کی آزادی کا بھی وقت قریب آگیا تھا۔ فلپائن آزاد ہُوا چاہتا تھا، ایشیائی ممالک سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ کچھ کو یقین تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا اپنے عہد پر قائم رہے گا لیکن کچھ کو شبہ بھی تھا۔ ہندوستان برطانوی اقتدار سے آزاد ہونے کے لیے عدم تشدد کی جنگ کر رہا تھا۔ کیا آزادی مل جائے گی؟

قریب ہی انڈوچین، انڈونیشیا اور ہانگ کانگ اُس دن کا انتظار کر رہے تھے، جب وہ فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہوں گے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہونے پر یو این او نے اپنا کام شروع کیا۔ چین "پانچ بڑوں" کی سربراہ کمیٹی کا رُکن تھا۔ جنرل اسمبلی اور سیکیورٹی کونسل میں قوم پرست حکومت کو نمائندگی حاصل ہوئی۔ جنگ میں تباہ شدہ مُلکوں کی تعمیر کے لیے مختلف طریقے تلاش کیے گئے۔ پورے ایشیا اور یورپ کو غذائی اشیاء، کپڑے، زرعی اور دوسرا ساز و سامان مہیّا کیا گیا۔ جہاں کہیں ضرورت ہوئی وہاں مشورہ بھی دیا گیا۔ تمام ملکوں کے باشندوں کی صحت بہتر بنانے، تعلیم میں اضافہ کرنے اور انسانی حقوق دلانے کی کوشش کی گئی۔

عالمی امن کے لیے مشترکہ کوششیں جاری رہیں لیکن بعض اقوام کو اپنا مفاد ملحوظ رہا۔ انھوں نے غیر ملکی امداد سے صحیح فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بعض ملکوں میں یہ امداد عوام تک نہ

پہنچ سکی۔ ۱۹۴۶ء میں جزائر فلپائن آزاد ہو گئے۔ ہندوستان بھی آزاد ہو گیا لیکن اُس نے ۱۹۴۸ء میں دولتِ مشترکہ کا رُکن رہنے کا فیصلہ کیا۔ امداد کے باوجود چینیوں کی حالت بہتر نہ ہوئی۔ یہ لوگ پہلے ہی سے غریب تھے۔ جنگ نے اُن کی حالت اور بھی تباہ کر دی۔ صنعتی مراکز ختم ہو گئے اور ان کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔

قوم پرست چینی اور کمیونسٹ دونوں جاپان کے خلاف متحد ہو گئے۔ لوگوں میں آزادی کی رُوح پھر بیدار ہونے لگی۔ انھوں نے قوم پرست حکومت سے اُس کی بساط سے زیادہ مطالبات کرنے شروع کر دیے۔ اُنھیں زندہ رہنا تھا، اُنھیں زمین درکار تھی۔ زمین نہ ہونے کی وجہ سے وہ ان ٹیکسوں کو بھی ادا نہیں کر سکتے تھے جو اُن پر لگائے گئے تھے۔ وہ امداد کے طالب تھے۔ ان میں سے اکثریت کی یہ رائے تھی کہ مغرب ناکام ہو چکا ہے۔ وہ اس بات کو کوتاہ بینی پر محمول کرتے تھے کہ جنرل چیانگ کائی شیک کو زمانۂ جنگ میں بھی اتنی کثیر امداد ملتی رہی۔

اس کے بعد چینی کمیونسٹ آگے آئے اور انھوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کیا۔ قوم پرستوں کے ساتھ اُن کا الحاق ختم ہو گیا۔ وہ ان کے سامنے تمام مسائل پر تنقید کرنے لگے۔ سب سے پہلے انھوں نے جنرل چیانگ سے نجات پائی، جو زیادہ تر اہلِ چین کے لیے قدیم جابر دَور کی یادگار بن کر رہ گیا تھا۔ انھوں نے تیزی سے سرکاری فوجوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا اور اُنھیں مُلک سے باہر نکال دیا۔ قوم پرستوں کو فارموسا میں پناہ لینی پڑی۔

رُوس ڈاکٹر سن یاٹ سین کا پُرانا دوست تھا۔ اُس نے چینی کمیونسٹوں کی مدد کی۔ مدد کے طریقے تو معلوم نہیں تاہم اتنا معلوم ہے کہ اہلِ چین نے اپنی بقا کے لیے اس امداد کو قبول کیا۔ اب یہ کام ضروری تھا کہ ناکام حاکموں سے نجات حاصل کی جائے اور زمین کو اِس طرح تقسیم کیا جائے کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصّہ مل جائے۔ رُوس جانتا

تھا کہ کسانوں کو اصلاحات کا عہد دے کر کس طرح خوش رکھا جاتا ہے۔ وہ لوگوں کو سنبھالنا جانتا تھا۔ اگرچہ پروپیگنڈا اکثر اوقات تلخ ثابت ہُوا تاہم اچھے نتائج برآمد ہونے لگے۔ روپے کی قیمت متوازن ہونے لگی۔ زمین تقسیم ہو گئی۔ ٹیکس اگرچہ بھاری تھے لیکن انصاف کے ساتھ لگائے گئے اور عوام میں نیا ولولہ عود کر آیا۔

مغرب یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے مشکل سے اِن باتوں کا یقین آ رہا تھا۔ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی کہ رُوس اور چین مل کر کام کریں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اُن میں کبھی بھی دوستانہ تعلقات قائم نہیں رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مغرب رُوس سے خوف زدہ تھا جس کے ساتھ مل کر اُس نے جرمنی کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ کیا ہونے والا ہے؟ یورپ کا ایک ایک مُلک باری باری رُوس کے قبضے یا اثر میں چلا جا رہا تھا۔ وہ چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا۔

چین کا جو جزیرہ نما بحیرۂ جاپان میں نکلا ہُوا ہے یعنی کوریا، وہ دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جنگ بندی اور شہری حکومت کو بحال کرنے کے لیے یہ ایک عارضی انتظام تھا۔ ۳۸ عرض البلد کے نیچے کا نصف حصّہ ریاست ہائے متحدّہ امریکا کی ذمہ داری بن گیا تھا اور شمالی حصّے کی آبادکاری رُوس کے ذمّے تھی۔ نظم و نسق بحال ہوتے ہی کوریا سے تمام افواج کا انخلا ضروری تھا تاکہ وہاں کے باشندے اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ یہ منصوبہ کامیاب نہ رہا۔ امریکا کی زیرِ نگرانی جنوبی کوریا میں ایک حکومت قائم ہوئی اور شمالی حصّے میں رُوس کی زیرِ نگرانی کمیونسٹ حکومت کام کرنے لگی۔ اُس نے جنوبی حکومت سے مفاہمت کرنے سے انکار کر دیا اور بدمزگی پیدا ہو گئی۔

۲۵ جون ۱۹۵۰ء کو شمالی کوریا نے جنوبی کوریا پر حملہ کر دیا۔ اقوامِ متحدّہ کی طرف سے امریکا نے اِس حملے کا مقابلہ کیا۔ اس طرح خونریز جنگ شروع ہو گئی، جس کا سلسلہ کوریا کے انتہائی جنوبی سرے اور شمال میں منچورین سرحد تک پھیل گیا۔ دونوں فریقین کو

غیر معمولی نقصان اُٹھانا پڑا۔ چین نے شمالی کوریا کو کمک پہنچائی تو اقوامِ متحدہ کی فوجوں کو پھر جنوب میں ہٹنا پڑا۔ امریکیوں کو چینیوں کے خلاف لڑنا پڑا، جنھیں وہ ہمیشہ اپنا دوست سمجھتے رہے تھے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو اُن کے ساتھ مل کر وہ جاپان کے خلاف لڑے تھے۔

کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ چین نے بیرونی اقتدار قبول کر لیا ہے اور رُوس کا تابع ہو گیا ہے۔ کچھ کا خیال تھا کہ چین محض اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنے کے لیے رُوس کا سہارا لے رہا ہے۔ اس کے بعد الگ ہو جائے گا۔

ہر شخص سمجھتا تھا کہ کوریا کی جنگ جلد ختم ہو جائے گی لیکن وہ پُورے تین سال جاری رہی۔ ایک سال کے بعد اقوامِ متحدہ نے شمالی و جنوبی کوریا کے درمیان مفاہمت کرانے کی کوشش کی تاکہ خونریزی ختم ہو جائے۔ بالآخر ۲۷ جولائی ۱۹۵۳ء کو بڑی ردّ و قدح کے بعد پن منجم میں عارضی صلح نامہ ہو گیا۔

اب قیامِ امن و بحالی کے لیے بہت کچھ کرنا تھا۔ کوریا کا اتحاد ضروری تھا۔ صدر آئزن ہاور نے فوجی و اقتصادی امداد دینے کا عہد کیا۔ اقوامِ متحدہ نے تعمیرِ نو کا ایک پروگرام شروع کیا۔ اِس طرح جنوبی کوریا میں کمیونزم کی ترقی رُک گئی، قومی آزادی کو فروغ حاصل ہُوا اور اُس کی فوجی طاقت بڑھی۔

بایں ہمہ جنوبی کوریا کی مطلق العنانیت اور بیرونی امداد کے غیر دانش مندانہ استعمال کی وجہ سے یہ حِصّۂ مُلک ان اقوام سے کٹ گیا جو اُس کے ساتھ دوستانہ سلوک کرتیں۔ کچھ سیاست دان جو اہلِ کوریا سے واقف تھے، یہ سمجھنے لگے کہ اس ملک کو ازسرِنو تعمیر کرنے کا کام پھر اقوامِ متحدہ کو سنبھال لینا چاہیے اور چین اور رُوس سے گفت و شنید کر کے اس کے اتحاد کی کوشش کرنی چاہیے۔

چینیوں میں انقلاب کی روح زندہ تھی، ان کی ضروریات لامحدود تھیں، اس لیے وہ ہر وہ قدم اُٹھانے کے لیے تیار تھے جسے وہ اپنے حق میں سمجھتے تھے۔ وہ مغرب کے وعدوں پر مزید بھروسا نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہی امریکا پر۔ اُن کا پڑوسی مُلک رُوس معجز نما ترقی کر رہا تھا۔

دسواں باب

چینیوں کا رہن سہن

دُنیا کے ہر چار انسانوں میں سے ایک چینی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اُن کے متعلق بہت سی باتیں جاننا چاہیں گے۔ ان کا مُلک ریاست ہائے متحدہ امریکا کا دوتہائی ہے۔ چین کا جغرافیائی محلِ وقوع شمالاً جنوباً ایک سا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہاں کے لوگ فطرتاً جمہوریت پسند واقع ہوئے ہیں۔

اگرچہ چین سیکڑوں سال تک اعلیٰ ترین ثقافت کا مرکز رہا ہے اور یہاں دُنیا کے عظیم ترین فلسفی پیدا ہوئے ہیں تاہم اس وقت اس کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس کی

وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۹ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی نے جو دس سال قبل جاپان کے خلاف چینی قوم پرستوں کے ساتھ متحد ہو گئی تھی، جنرل چیانگ کائی شیک کی فوجوں کو ہرا کر عوامی جمہوریہ کی بنیادیں استوار کیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا نے اس حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو سوویت یونین کے طرز پر قائم ہوئی تھی۔ وہ قوم پرستوں کی حکومت کو صحیح سمجھتا رہا جو جزیرۂ فارموسا میں گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ چینی عوامی جمہوریہ کو محض عارضی سمجھتا رہا۔ ان حالات میں پیپنگ میں امریکی سفارت خانہ قائم نہ ہو سکا اور عرصۂ دراز تک اخباری نمائندے اور سیاح تک چین میں نہ داخل ہو سکے۔ آئندہ کئی سال تک باقی دنیا کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ چینی باشندے کمیونسٹ حکمرانوں کے تحت کس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس عرصے میں وہاں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہو گئیں —— ایسی تبدیلیاں جو سابقہ چین

میں ناممکن تھیں۔

گھریلو زندگی

دُنیا کے کسی مُلک میں اتنی خاندانی یک جہتی اور محبّت نہیں پائی جاتی جتنی چین میں پائی جاتی ہے۔ یہاں کا گھریلو نظام عظیم فلسفی کنفوشیس کی تعلیمات پر استوار کیا گیا تھا جو پانچویں اور چھٹی صدی قبل مسیح میں ہو گذرا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک خاندان اپنے ہر فرد کو اُس کی جگہ اور اس کی ذمّہ داریاں سمجھا سکتا ہے اور یہ کہ ہر خاندان کو ایک مختصر سی جماعت کی طرح رہنا چاہیے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ سمجھے۔ اُس کی عزّت ہو اور وہ دوسروں کی عزّت کرے۔ جہاں تک انفرادی تکریم کا تعلّق ہے، چینی خاندان میں جمہوریت کا عنصر غالب رہا۔ اس یک جہتی سے قوم کو بھی فائدہ پہنچا کیونکہ اگر عوام میں افراتفری مچی ہو تو حکومت کی ذمّہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ صدیوں تک اہلِ چین اپنے خاندانوں کے وفادار رہے ہیں۔ کیمونسٹ دورِ حکومت میں برسرِ اقتدار لوگوں کو خاندان کی جگہ لینی ہے۔ اسی صورت میں وہ عوام کی وفاداری حاصل کر سکتے ہیں۔

چینیوں کی گھریلو زندگی میں اس محبّت و یگانگت کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ شروع سے ہی ایک جگہ جم کر رہے ہیں۔ دُنیا کی دوسری اقوام کی طرح یہ لوگ خانہ بدوش نہیں تھے۔ وہ تاریخی زمانے سے پہلے سے اپنے دیہاتوں اور قصبوں میں رہتے چلے آئے ہیں۔ البتّہ اُن کے شمال میں خانہ بدوش قبیلے آباد تھے جو اکثر انھیں پریشان کرتے رہتے تھے۔ مغرب میں اہل ہند آباد تھے جو شروع میں گلّہ بانی کرتے تھے۔ یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں بسنے والی اقوام کی ابتدا بھی اسی طور ہوئی لیکن چینی شروع سے ہی کھیتی باڑی کرتے تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے خود کبھی دودھ یا دودھ

سے تیار ہونے والی اشیاء استعمال نہیں کیں ۔منگول دودھ کی قدر و قیمت پہچانتے تھے اور اُسے استعمال کرتے تھے ۔ ہندوستانی باشندے بھی مذہبی رسوم میں گھی جلاتے تھے لیکن چینیوں نے حال ہی میں دودھ پینا شروع کیا ہے اور اس کی غذائی اہمیت پہچانی ہے۔

چینیوں کے جو ابتدائی زرعی آلات دستیاب ہوئے ہیں وہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ پرانے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اب سے ساڑھے تین ہزار سال پہلے اپنے کھیتوں میں پانی دینا جانتے تھے۔ یہ لوگ شمالی میدانوں میں آباد تھے جن کی مٹی نرم اور زرخیز تھی۔ وہاں یہ ابتدائی آلات موزوں ثابت ہوئے ہوں گے۔

جب شہر آباد ہونے لگے تو کسانوں کو زیادہ اناج اُگانا پڑا تاکہ وہ شہری باشندوں نیز اپنی ضروریات کو پُورا کرسکیں۔ یہ لوگ اُس زمانے میں بھی اچھے کاشت کار تھے، جب دُنیا کی دوسری اقوام ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف چلتی پھرتی رہتی تھیں۔

شہری اور دیہاتی چینیوں کی گھریلو زندگی بہت کچھ ایک جیسی تھی۔ باہمی رشتوں کی عزت کی جاتی تھی، مردہ عزیزوں کو محبت سے یاد کیا جاتا تھا اور بچوں کی اچھی نگہداشت کی جاتی تھی۔ کوئی خاندان بھی اپنے تئیں الگ تھلگ محسوس نہیں کرتا تھا۔ زندہ لوگ مُردوں کو فراموش نہیں کرتے تھے ورنہ مصیبت آجاتی تھی۔ ایسے خاندان کو ساری برادری مطعون کرتی تھی۔ اسی وجہ سے اہلِ چین کنفوشیس سے بہت پہلے سے اپنے مرحوم اعزّہ کو یاد رکھنے نیز اُن کی ضروریات پُوری کرنے کے لیے تحفے چڑھاتے آتے ہیں۔ پُرانے زمانے میں اِس مقصد کے لیے قربانیاں ہوتی تھیں اور جانور یا روپیہ جلایا جاتا تھا۔ بعد میں زندہ جانوروں کی بجائے "کاغذی گھوڑے" استعمال کیے جانے لگے اور سونے چاندی کی جگہ کاغذ کے نوٹوں نے لے لی۔ قبروں پر کاغذی مکان، فرنیچر، ملازم عورتیں اور کھانا تک چڑھایا جاتا تھا۔ ان باتوں کا مقصد محض مُردہ عزیزوں کو یاد کرنا تھا جس طرح مغرب میں پھُول استعمال کیے جاتے ہیں۔ اکثر اوقات یہ کام زندہ عزیزوں کے فرائض میں

شمار ہوتا تھا۔

اس قسم کے فرائض کے احساس سے چینی معاشرے کو بڑی تقویت پہنچی اور اس میں بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ چین میں پاگل خانے نہیں تھے اور نہ ہی انشورنس کمپنیاں۔ خاندان کے کسی فرد کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا خواہ وہ کتنا ہی بدنام، غریب یا بیمار ہو۔ وہ ہمیشہ گھر واپس آسکتا تھا اور اپنے عزیزوں سے اپنا حِصّہ طلب کر سکتا تھا۔ اُسے کسی قسم کی انشورنس یا ضمانت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہ دونوں چیزیں اُسے اپنے خاندان میں ہی مل جاتی تھیں۔ اگر کوئی بچّہ پیدائشی طور پر کمزور دماغ کا مالک ہوتا تھا، تو خاندان کے افراد اُسے ناگزیر سمجھتے ہوئے قبول کر لیتے تھے۔ اُسے کسی دور دراز درس گاہ میں داخل نہیں کرایا جاتا تھا۔ ہر شخص اُس خاندان کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا جس میں وہ پیدا ہُوا ہے۔

چینی خاندان میں حفاظت کا احساس کس طرح ہوتا تھا؟ نہ صرف یہ کہ ہر فرد اپنی "زندگی" میں خاندان کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا بلکہ اُس کے تعلّقات ماضی اور مستقبل دونوں سے وابستہ ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شادی مرد عورت کی مرضی سے نہیں ہوتی تھی بلکہ خاندان کی مرضی سے، کیونکہ خاندان ہی آئندہ ذمّہ داریاں بھی سنبھالتا تھا۔

مغرب کے لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ کئی خاندان مل جل کر ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ یہ ضرب المثل ہے کہ ایک ہی چھت کے نیچے دو خاندان رہیں گے، تو لڑائی ضرور ہو گی لیکن پُرانے زمانے میں چین میں ایک ہی چھت کے نیچے چھ چھ خاندان رہتے تھے۔ بوڑھی پردادی صحن میں بیٹھی دھوپ تاپتی رہتی تھی اور ان کے مُنہ میں لمبا پائپ ہوتا تھا۔ وہ اپنی جوانی کے زمانے کے قِصّے سُنایا کرتی تھیں۔ دادا دادی گھر کے بڑے سمجھے جاتے تھے لیکن پردادی کا وہ بھی احترام کرتے تھے۔ گھر میں انہی کا حکم چلتا تھا۔ ان کے بعد والدین ہوتے تھے۔ جن کی عمر زیادہ ہوتی تھی وہ پورے گھر کی

ذمّہ داری سنبھالتے تھے۔ اگر بڑے بیٹے کی شادی ہو جاتی تھی تو وہ باپ کے کاروبار میں اُس کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اُس کا ننھا بچّہ ماں کے سپرد رہتا تھا لیکن وہ ہر روز اُسے پردادی، دادا، دادی کے پاس ضرور لے جاتی تھی اور شام کو اُس کے باپ کے پاس۔ ان سب کے علاوہ گھر میں دُور کا ایک چچا بھی رہتا ہے جس کا کاروبار تباہ ہو چکا ہے اور وہ بہتر دنوں کی امید میں یہاں پڑا ہے۔ شاید ایک بچّہ، خالہ یا چچی بھی رہتی ہیں جنھوں نے رسم و رواج کے مطابق دوبارہ شادی نہیں کی۔ سارے گھر کے کپڑے جُوتے مرمّت کرنا اور انھیں ٹھیک رکھنا اُن کے ذمّے ہے۔ اس کا امکان بھی ہے کہ گھر میں کوئی چچازاد بھائی بھی رہتا ہو جسے اہلِ چین "بھائی" کہتے ہیں۔ اس کا کوئی اور رشتہ دار نہیں ہے، اس لیے وہ بھی یہاں رہتا ہے۔

خاندان کے تمام افراد ساتھ رہتے تھے، ساتھ کھاتے تھے اور ساتھ کھیلتے تھے البتہ خواب گاہیں سب کی الگ ہوتی تھیں یا شاید صحن میں تنہائی کا کوئی موقع مل جاتا ہو۔ کنفوشئیس کی تعلیمات کا عوام پر گہرا اثر تھا، اس لیے گھر کے تمام افراد پیار محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور ایک دوسرے کا خیال کرتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تھا تو اُن کے بزرگوں کو افسوس ہوتا تھا اور حفاظت کا احساس جاتا رہتا تھا۔

کیونسٹ حکومت کے تحت چینی گھرانوں کا کیا حال ہے؟ جو لوگ وہاں ہو آئے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ وہاں کسی شعبے میں بھی اتنی تبدیلی رونما نہیں ہوئی جتنی گھریلو زندگی میں ہوئی ہے۔

گھر کے افراد میں اب وہ خلوص اور لگاؤ نہیں پایا جاتا جو پہلے پایا جاتا تھا۔ اب گھر کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ بزرگوں کا ادب احترام کم ہو گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نئی حکومت ایک نئے نظریے پر عمل پیرا ہے۔ اُسے لیڈروں کی ضرورت تھی۔ نئے لیڈروں کی تربیت پُرانے ماحول میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اُسے بدلنا ضروری

تھا۔ پورے معاشرے کو نئے طرز پر ازسرِنو ترتیب دیا گیا تاکہ چین کی ساٹھ کروڑ آبادی کو کام مل سکے۔ طلبا کو ترقی پسند خیالات کی ترغیب دی گئی اور بتایا گیا کہ اب بزرگوں کا زیادہ احترام کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ گھریلو زندگی اتحاد اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اب شادی خاندان کی مرضی سے نہیں ہوتی بلکہ جوان لڑکے لڑکیاں اپنی پسند سے اپنے ساتھی کا انتخاب کرتے ہیں بشرطیکہ مقامی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان اور پولیس کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ اب عورتوں کو طلاق حاصل کرنے کی بھی اجازت ہے۔

چینیوں کی گھریلو زندگی کو اُن پنچایتوں سے بھی دھکّا لگا ہے جو کسانوں کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ یہ قدم بصورتِ مجبوری اُس وقت اُٹھایا گیا، جب چین کو یقین ہو گیا کہ وہ مقرّرہ مُدّت کے اندر پیداوار کی مطلوبہ مقدار حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ پنچایتیں ۱۹۵۸ء میں شروع ہوئی تھیں۔ ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی۔ چینی حکّام نے سرکاری طور پر جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں، ان کے مطابق وہاں ۲۶۰۰۰ پنچایتیں ہیں، جن میں سے ہر ایک میں ۲۰٫۰۰۰ سے ۶۰٫۰۰۰ افراد تک شامل ہیں لیکن ایک سال بعد ایک اخبار نویس نے یہ اطلاع دی تھی کہ اصلی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اصل میں یہ پنچائتیں قدیم طرز کے دیہاتوں کے مجموعوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شروع میں اِن پنچایتوں میں دس کروڑ سے بیس کروڑ تک لوگ شامل تھے۔

اِن جماعتوں کی ترتیب چینیوں کی گھریلو زندگی سے اس درجہ مختلف ہے کہ یہاں اس کا مختصر سا ذکر ضروری ہے۔ پنچایت کا اصل منشا یہ ہے کہ وہ اپنے ارکان کو کام کرنے کے سوا باقی تمام ذمّہ داریوں سے آزاد کر دے۔ مرد عورت جداگانہ اقامت گاہوں میں رہتے ہیں، بڑے بڑے کمروں میں مل کر کھانا کھاتے ہیں اور جماعتوں کی شکل میں ایک نگراں کے تحت دیر تک کام کرتے ہیں۔ بچّوں کے لیے دارالاطفال بنے

ہوتے ہیں۔ جب وہ کچھ بڑے ہو جاتے ہیں تو انھیں ابتدائی سکولوں میں داخل کر دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی حکومت کے حق میں پروپیگنڈے کی نوعیت کے نغمے یاد کرتے ہیں اور گاتے ہیں۔ زیادہ عُمر کے بچّے ہوسٹلوں میں قیام کرتے ہیں جہاں انھیں نصاب کے علاوہ کمیونسٹ اصول سکھائے جاتے ہیں۔ ایسے بالغ اور جوان جنھوں نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی، خاص طرز کے اسکولوں میں کوئی دست کاری سیکھتے ہیں اور کمیونزم کے اصول یاد کرتے ہیں۔ بُوڑھوں کا علیحدہ انتظام ہے۔ وہ اپنے اعزّہ پر بار نہیں بنتے اور نہ ہی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ جب مطلوبہ پیداوار حاصل نہ ہو سکی تو فوراً یہ پنچایتی نظام شروع کر دیا گیا تھا کیونکہ عوام پہلے ہی تنگ تھے اس لیے اِس نظام میں نرمی پیدا کی گئی۔ اوسط رفتار کے ساتھ وہ طویل عرصے تک جاری رہ سکتا ہے۔ شاید آپ یہ دریافت کریں کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ تنگ ہو تو کیا وہ کسی دوسری جگہ جا سکتا ہے؟ یہ آسان نہیں ہے کیونکہ جماعت کے ہر رُکن کے پاس ایک راشن کارڈ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی جگہ بدلتا ہے تو اُسے راشن کارڈ کے ساتھ اجازت نامہ منسلک کرنا پڑتا ہے، ورنہ اُسے دوسری جگہ کھانا نہیں ملے گا۔

عوامی جمہوریّہ چین کے تحت گھریلو زندگی میں دوسری اہم تبدیلی اُس وقت پیدا ہوئی، جب عورتوں کی حیثیت بدلی۔ چھوٹے بچّوں کی پرورش کے لیے دایہ خانے قائم کیے گئے۔ بڑے بچّوں کے لیے سکول جانا لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ بُوڑھوں کے لیے جداگانہ ادارے قائم کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح عورتیں گھریلو ذمّہ داریوں سے مکمّل طور پر سبکدوش کر دی گئی ہیں۔ وہ زراعت اور صنعت و حرفت میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کر سکتی ہیں۔ نئی حکومت کے ابتدائی دس برس میں عورتوں کی تعلیم پر بھی خاص زور دیا گیا ہے اور اب انھیں چینی معاشرے میں نیا مقام حاصل ہے۔

خاندانی یک جہتی ختم ہو جانے سے چین کی قدیم تنظیم پر بھی بُرا اثر پڑا ہے، جو ہزاروں سال سے چلی آ رہی تھی۔ گاؤں کے بڑے بوڑھوں، پنچایتوں اور کاروباری جماعتوں کی جگہ یوتھ لیگ قائم ہوئی ہیں۔ عورتوں کی جماعتیں الگ ہیں اور ٹریڈ یونینیں علیٰحدہ۔ وہ باہمی رشتہ داریوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتیں۔ تمام رشتوں کو ختم کرکے یہاں کے باشندوں کو اب ایک نئے انداز سے آپس میں جوڑا گیا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے حکّام کے خوف سے کوئی شخص اپنے دل کی بات اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں تک سے نہیں کہہ سکتا۔ اس فضا نے قدیم خاندانی بنیادیں ہلا دیں۔

نئی حکومت نے عوام کو مجبور کیا کہ وہ کمیونسٹ خیالات کو اپنائیں۔ اِس مقصد کے لیے اُس نے جو ذرائع اختیار کیے، اُن کی وجہ سے ہر شخص خائف رہنے لگا۔ لوگوں نے ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا اور اپنے احساسات کا گلا گھونٹ دیا۔ جو لوگ ایسا نہ کر سکے، انھیں صاف کر دیا گیا۔ دوسروں کو عبرت ہوئی اور انھوں نے حکومت کے احکام کو ماننا شروع کر دیا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی چغلی کھانی شروع کر دی۔ اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگے۔ ان سے نجات پانے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ ہر شخص سب کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتا تھا۔ اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تھا تو سب کے سامنے اس کا مقدمہ پیش ہوتا تھا اور اتنی ذلت ہوتی تھی کہ اس سے موت بہتر۔ چار و ناچار اقبالِ جرم میں ہی عافیت تھی۔ اِن حالات میں دوستی یا کسی کا ساتھ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا۔

دُنیا چینیوں کی زندگی میں اِس انقلابِ عظیم کو دیکھ کر حیران رہ گئی لیکن کمیونسٹ لیڈروں کے خیال میں اس ملک کو دنیا میں ارفع مقام دلانے کا یہی طریقہ تھا۔ بہتر حالات کے لیے ہر چیز قربان کرنی پڑتی ہے۔

چین سیکڑوں سال تک دو قدرتی دُشمنوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ ایک کثرتِ آبادی

اور دوسرے سیلاب و خشک سالی۔ دونوں کا نتیجہ قحط کی شکل میں نمودار ہوتا تھا۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ غلّہ پیدا کرے، سیلابوں کی روک تھام کے لیے بند تعمیر کیے جائیں اور خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے آب پاشی کے نظام کو بہتر بنایا جائے۔ بہتر زرعی آلات اور مشینوں کے استعمال سے پیداوار میں اضافہ ہوگا، اس کی نقل و حمل کے لیے بہتر سڑکوں کی ضرورت ہو گی اور صنعت و حرفت کو ترقی دینا ضروری تھا۔ دریائے زرد میں مسلسل طغیانی آتی رہتی تھی۔ اس پر ساٹھ بند تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جن میں سے ایک دُنیا کا بلند ترین بند ہے تاہم شروع میں جو غلّہ ملک میں پیدا ہُوا وہ سب کا سب اہلِ مُلک کے کام نہ آسکا کیونکہ اُس کی کچھ مقدار مشینوں کے عوض رُوس کو برآمد کرنی پڑی۔

چین میں ایک چیز کی افراط تھی اور وہ تھے آدمی۔ ان سے کوئی کام لینے کے لیے انھیں اس کے فائدے کا یقین دلانا ضروری تھا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ وہ خوب محنت کریں۔ دباؤ اور خوف کی جگہ خوش دلی اور یقین ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک نئے طریقے کی ضرورت پڑی۔

حکومت نے بہت سے ایجنٹوں کی خدمات حاصل کیں جو پُورے مُلک میں پھیل گئے اور انھوں نے عوام کو کمیونسٹ خیالات اور محنت کی تعلیم دی۔ انھوں نے بتایا کہ ملک کی بقا خطرے میں ہے۔ دوسرے ممالک اُس کی آزادی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا امریکا کا بحری بیڑہ قریب نہیں ہے؟ فارموسا کا کیا حال ہے؟ چین اور ہندوستان کی درمیانی سرحد کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا۔ چینی دیہاتوں میں لاؤڈ سپیکروں کے ذریعہ ان خیالات کی تشہیر کی گئی۔ ہزاروں پوسٹر چھاپے گئے۔ لوگوں نے شروع شروع میں باطنی طور پر ان خیالات کی مخالفت کی۔ ہزاروں نے انھیں قبول نہیں کیا۔ اور وہ اپنی جان سے گئے لیکن آہستہ آہستہ چین کے مستقبل کے خیال سے نوجوانوں نے

ان اصولوں کو مان لیا اور ان کی خاطر وہ اسی محنت و تن دہی سے کام کرنے لگے، جس طرح پہلے اپنے خاندان کے لیے کرتے تھے۔

پُرانی رُسوم اور قدیم نظام کے ٹوٹنے سے چینی معاشرہ مکمل طور پر تبدیل ہوگیا۔ اب کنفوشیس اُسے پہچان بھی نہیں سکتا۔

زراعت

کسانوں کی تنظیم کے لیے جو پنچایتیں قائم ہوئی تھیں، ہم ان کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ چین کی آبادی کا تقریباً ۸۵ فی صدی حصہ شروع سے ہی زراعت کرتا رہا ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے تحت اب کچھ زرعی مشینیں بھی استعمال ہونے لگی ہیں اور کچھ تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں تاہم چینیوں کے قدیم زرعی آلات اور طریقوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو خاصے ترقی یافتہ تھے۔

خواہ کوئی کسان شمالی چین میں رہتا ہو جہاں سال میں صرف ایک فصل پیدا ہوتی تھی یا جنوبی چین میں رہتا ہو جہاں آب پاشی کی سہولتیں میسر تھیں اور سال میں دو تین فصلیں اُگائی جا سکتی تھیں، دونوں کی زندگی میں بہت سی باتیں ایک جیسی تھیں۔ دونوں کا مرکز دیہات میں ہوتا تھا جہاں ان کا خاندان اور تمام رشتے دار رہتے تھے۔ گھر کے اندر ایک صحن ہوتا تھا اور آگے بہت سے کمرے۔ غلہ گاہنے کی جگہ، تالاب، کھاد ڈالنے کی جگہ، باغیچہ اور قبرستان مشترک ہوتے تھے۔

چین کے بہترین زرعی خطے شہروں سے دور ہونے کی بجائے اُن کے نزدیک واقع ہیں کیونکہ یہ لوگ امریکا یا یورپ کے کسانوں کی طرح مصنوعی کھاد استعمال نہیں کرتے بلکہ انسانوں کا فضلہ کھیتوں میں ڈالتے ہیں۔ یہ فضلہ شہروں سے ہی زیادہ مقدار میں حاصل ہو سکتا ہے۔ اِس مقصد کے لیے کسانوں کے ایجنٹ شہروں میں گھومتے ہیں

اور مطلوبہ کھاد کھیتوں تک پہنچاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چین کے بہترین باغات اور کھیت شہروں کے چاروں طرف واقع ہیں۔ یہ لوگ فضلے کو زمین دوز نالیوں میں بہا دینے کی بجائے اُسے اپنے کھیتوں میں استعمال کرتے ہیں۔

شمالی چین میں گدھوں اور گھوڑوں کی مدد سے کاشت کی جاتی ہے۔ چینی گدھے واقعی قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ بڑے چھوٹے اور کمزور ہوتے ہیں لیکن وہ بہت زیادہ وزن اُٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔ اُن کی معصوم آنکھوں سے سادگی ٹپکتی ہے۔ اُن کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں گرد سے پُر ہوتی ہیں۔ سواری میں استعمال ہونے والی دو پہیّوں والی گاڑیوں میں بیل یا گھوڑے جوڑے جاتے ہیں۔ شمال کے دیہاتی علاقوں میں باربرداری کے لیے بھی ایسی ہی گاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔

جنوبی چین میں بھینسیں اور زرد گائیں محنت مشقت کا کام کرتی ہیں۔ بھینسیں بڑی بلند و بالا اور قوی الجثہ ہوتی ہیں۔ اُن کے سینگ بے حد فراخ اور کھال نہایت سخت ہوتی ہے۔ انھیں کیچڑ سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے۔ کسان کی آنکھ بچی اور وہ قریب کے تالاب میں پہنچ گئیں۔ صرف اُن کے نتھنے پانی سے باہر رہتے ہیں۔ کسان اپنی زبان میں چیخ چیخ کر اُن سے کام لیتے ہیں۔ جنوب میں گدھے بھی باربرداری کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ہتھ گاڑی کو ایک آدمی اکیلا چلاتا ہے اور اس پر منوں غلّہ لاد لیتا ہے یا چار آدمیوں کو بٹھا لیتا ہے۔ اِن گاڑیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ تنگ سڑکوں پر بھی چل سکتی ہیں اور اُن پر خواہ سامان لدا ہو یا آدمی بیٹھے ہوں، وہ کھیتوں اور کیچڑ پانی دونوں میں چل سکتی ہیں۔ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی اس گاڑی کا رواج باقی ہے۔

شمالی چین کی آب و ہوا نیم خشک ہے، زمین ریگستانی ہے اور کبھی کبھی وہاں سیلاب بھی آتے رہتے ہیں۔ وہاں کے کسان انہی حالات میں محنت کرتے ہیں۔ پیداوار بھی

کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ گیہوں اور باجرہ یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔

جنوبی حصے کے کسان اپنے کھیتوں میں کئی فصلیں بوتے ہیں۔ آب پاشی کی سہولت بھی میسّر ہے۔ کسان کو اُس پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ بہت سے کھیت پہاڑیوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ موسمِ خزاں میں جو گیہوں بویا جاتا ہے، وہ موسمِ گرما کے شروع میں کاٹ لیا جاتا ہے۔ اس کے فوراً بعد کھیتوں کو جوت کر ان میں چاول کی کاشت کے لیے پانی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دھان کی پنیری پہلے سے تیار ہوتی ہے۔ پانی بھرے کھیت میں بھینسوں کی مدد سے ہل چلایا جاتا ہے۔ پست کھیت سے بلند کھیت میں پانی چڑھانے کے لیے چین میں لکڑی کا ایک عجیب سا اوزار استعمال کیا جاتا ہے جس میں لکڑی کے پھل لگے ہوتے ہیں۔ اُسے دونوں کھیتوں کے بیچ میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ٹھیک اوپر لکڑی کی ایک ٹکٹکی کھڑی کر دی جاتی ہے۔ چلانے والا ٹکٹکی سے لٹک کر اپنے پیروں سے اس چرخی کو چلاتا ہے اور پانی چڑھتا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ گھر کے تمام افراد کے علاوہ پاس پڑوس کے لوگ بھی اس کام میں لگ جاتے ہیں۔ ممکن ہے کمیونسٹ حکومت نے اب ان چرخیوں کو چلانے والوں کا علیحدہ کوئی انتظام کر دیا ہو۔

جب بالائی کھیت میں کافی پانی جمع ہو جاتا ہے تو نالی کو اچھی طرح بند کر دیا جاتا ہے اور کسان بھینسے کو ہانکنا شروع کرتا ہے۔ وہ بوجھ ڈالنے کی غرض سے ہل پر خود کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب یہ کام ختم ہو جاتا ہے تو پُورا کھیت تالاب معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد پنیری کو نکال کر اور اس کے خوشے بنا کر کھیت میں پھینک دیے جاتے ہیں جہاں بہت سے آدمی تیار کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اِس پنیری کو قطاروں کی شکل میں لگا دیتے ہیں۔ یہ قطاریں بالکل سیدھی، یکساں اور نہایت خوب صورت ہوتی ہیں۔ یہ منظر بڑا ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔

چاول کے کھیت میں پانی کی مقدار صحیح سطح پر قائم رکھنی پڑتی ہے۔ آنے والے

چند ہفتوں کے لیے پانی بھر لیا جاتا ہے اور پھر اُسے آہستہ آہستہ خشک ہونے دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پودے بڑے ہوتے رہتے ہیں۔ جنوبی چین کی گرم و مرطوب آب و ہوا چاول کے لیے نہایت موزوں ہے۔ جلد ہی پانی کا یہ کھیت سبز مخملی فرش بن جاتا ہے۔ جب چاول کٹ جاتا ہے تو اسی کھیت میں جاڑوں کے لیے گیہوں بو دیا جاتا ہے۔

چھوٹے چھوٹے کھیت جن میں پانی نہیں دیا جا سکتا، سرسوں اور تل بونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ موسمِ بہار کے شروع میں اُن میں زرد پھول کثرت سے کھلتے ہیں۔ سرسوں کے علاوہ مٹر وغیرہ کی کاشت بھی کی جاتی ہے جس کے پھولوں سے بڑی اچھی خوشبو نکلتی ہے۔ ان کے علاوہ سیم، لوبیا اور شکر قند بھی کاشت کیے جاتے ہیں۔

قدیم چین میں کھیتی باڑی کے وقت بڑی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ دیہاتیوں کی زندگی بڑی پُر لطف تھی۔ مل جُل کر کام کرنے کے علاوہ ہر شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں کسانوں کو اپنی پیداوار کا ایک بڑا حصّہ کاہل زمیندار کے حوالے کر دینا پڑتا تھا، تاہم گاؤں کا نظام کچھ ایسا تھا کہ ان محنتی لوگوں کو تفریح کے مواقع بھی مل جاتے تھے۔ شمالی چین کے طویل موسمِ سرما اور جنوبی چین کی طویل شاموں میں لوگ آگ کے چاروں طرف یا پختہ فرش پر جمع ہو جاتے تھے، کام کرتے جاتے تھے اور ساتھ ساتھ ہنسی مذاق، غپ شپ یا آنے والے میلے کی تیاری جاری رہتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس زمانے میں غربت اور بیماری کا دور دورہ تھا، تعلیم حاصل کرنا مشکل کام تھا اور لوگ بڑے ضعیف الاعتقاد تھے لیکن ہر شخص کو ذہنی آزادی حاصل تھی۔ کنفوشیس کی تعلیمات کا بھی اصل مقصد یہی تھا۔

عوامی جمہوریۂ چین کے قیام کے ساتھ یہ سب کچھ ختم ہوگیا۔ وہاں کے پچاس کروڑ کسانوں کی تنظیم از سرِ نو شروع ہو گئی۔ حکومت نے پہلے یہ اعلان کیا کہ وہ ساری زمین کسانوں میں تقسیم کر دے گی تاکہ زمیندار خواہ مخواہ بڑے بڑے قطعات کے مالک نہ بنے رہیں لیکن یہ منصوبہ کامیاب ثابت نہ ہو سکا۔ اس کے بعد مجموعی زراعت کا تجربہ کیا گیا اور جب اُس سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکے تو حکومت نے جلدی سے پنچایتی نظام شروع کر دیا لیکن ایک سال کے اندر وہ بھی بدل دیا گیا۔

شروع میں جب لوگوں نے یہ سُنا کہ وہ خود زمین کے مالک بن جائیں گے تو انھیں بڑی خوشی ہوئی۔ ہر کسان یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کھیت کا خود مالک ہو جسے وہ جوتتا ہے۔ جب یہ منصوبہ ناکامیاب ہوگیا تو حکومت نے دباؤ ڈالنا شروع کیا جس کے نتیجے میں لوگوں کی خوشی اور بے فکری رخصت ہو گئی۔ اب تفریحی پروگراموں میں بھی پروپیگنڈے کا عنصر غالب رہتا ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے تک تماشے کے طور پر جو تصویریں دکھائی جاتی تھیں وہ چین کی قدیم تاریخ کی ترجمانی کرتی تھیں۔ اب اُن کی جگہ سیاسی ڈرامے دکھائے جاتے ہیں جن میں دوسرے ممالک کے لیے بہت کچھ نفرت بھری ہوتی ہے۔ پہلے چھوٹے بچّوں کو اسکولوں میں ہلکے پھُلکے دلچسپ گانے سکھائے جاتے تھے۔ اب ان میں بھی پروپیگنڈا بھر دیا جاتا ہے۔ اور کمیونسٹ لیڈروں کی مدح وثنا کی جاتی ہے۔ دیہاتوں میں جو اشتہارات لگائے جاتے ہیں، ان میں غیر ملکیوں خاص طور پر امریکیوں کے لیے تلخی کا اظہار کیا جاتا ہے جو فارموسا میں قوم پرست حکومت کی مدد کر رہے ہیں۔ کمیونسٹوں کی رائے میں قدیم چینی ناولوں اور قصّوں کا پڑھنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

بعض دستکاریاں متروک قرار دے دی گئی ہیں جو فالتو وقت کا اچھا مصرف تھیں اور لوگوں کے تخیّل کو ہوا دیتی تھیں۔ نئی حکومت نے ہر کام کو ضروری قرار دیا ہے۔

حد یہ ہے کہ نئے سال، موسمِ بہار اور خزاں کے تیوہار تک ملک کو صنعتی بنانے کی خاطر قربان کر دیے گئے ہیں۔ ہزاروں سال سے چین میں یہ رواج چلا آرہا ہے کہ لوگ نئے سال کے لیے چیزیں جمع کر کے رکھتے ہیں۔ نمکین گوشت اور بڑی سے بڑی مچھلی کو دھواں دکھا کر محفوظ کر لیا جاتا تھا۔ چاٹے کی چھوٹی سے چھوٹی پتّیاں سُکھا لی جاتی تھیں اور بچّوں کے لیے بہترین کپڑے اور جُوتے تیار کرائے جاتے تھے۔ سال کا یہی دن ایسا ہوتا تھا جب چینی باشندے خوشی کے مارے دیوانے ہو جاتے تھے لیکن یہ سب ماضی کی باتیں ہو گئی ہیں۔ نیا چین لوگوں کی خوشنودی یا اُن کے دیوتاؤں کے لیے وقت ضائع نہیں کر سکتا۔ کیا باورچی خانے کے دیوتا کو نئے سال کی شکر پھر کبھی مل سکے گی؟

عام دست کار

پُرانے زمانے میں چین کے دیہاتوں میں ایسے دستکاروں کی کثرت تھی جو سب کے لیے روزمرّہ کی چیزیں تیار کرتے رہتے تھے۔ خام مال کی فراہمی کے مطابق مختلف مقامات مختلف تجارتوں کا مرکز بن گئے تھے مثلاً "فوچو" کاغذ کی چھتریوں اور نمکین مچھلیوں کے لیے مشہور تھا۔ کیو کیانگ چینی کپڑے اور برتنوں کا مرکز تھا، کیونکہ وہ چنگ ٹی چن سے زیادہ دُور نہیں اور چنگ شا پینل کے برتنوں کے لیے مشہور تھا۔

عوامی جمہوریہ چین قائم ہونے سے پہلے میں چنگ شا (صوبۂ ہنان کا صدر مقام) کے قریب ایک قصبے میں رہتی تھی اور جب بھی کہیں جاتی تھی مجھے کم از کم ایک درجن دست کار اپنے اپنے کام میں مصروف نظر آتے تھے۔ چینی دوکانوں کے تین طرف لکڑی کے تختے ہوتے تھے جنھیں صبح کے وقت ہٹا دیا جاتا اور رات کے وقت لگا دیا جاتا تھا۔ دن کے وقت آپ دوکان کا پُورا اندرونی حصّہ دیکھ

سکتے تھے۔

میرے گیٹ کے سامنے ایک آتش باز کی دوکان تھی۔ عام پٹاخے چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے لیکن اور بھی کئی طرح کے گولے بنتے تھے۔ بعض بڑے خوب صورت ہوتے تھے۔ ان پر اژدہوں اور دیوؤں کی تصویریں بنی ہوتی تھیں۔ آتش باز پہلے خوب صورت کاغذ چپکاتا تھا، پھر اُس پر موٹے کاغذ کی تہیں دیتا تھا۔ گولے کی نلی قدرے پیالہ نما ہوتی تھی۔ اس پر لکڑی کا ایک محدّب ٹکڑا ڈھک دیا جاتا تھا۔ گولے کو مضبوط بنانے کے لیے کاغذ اور گوند استعمال کیا جاتا تھا۔ اُوپر سے کیل جیسی ایک فولادی پن گاڑ دی جاتی تھی۔ اس کے بعد پن نکال لی جاتی تھی۔ اس کا سوراخ گیلی مٹّی سے بند کر دیا جاتا تھا اور بارود بھر کر فتیلہ لگا دیا جاتا تھا۔ اب گولا تیار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آتش باز کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے کہ ایک گولے کے بعد دوسرا گولا تیار ہوتا جا رہا ہے۔

اگلی دوکان سے دِن بھر برتنوں کی آواز آتی رہتی تھی۔ یہاں کیتلیاں، پتیلیاں، شمعدان اور پیتل کی سینکڑوں دوسری چیزیں بنتی رہتی تھیں۔ بعض گھروں میں بزرگوں کی دستاویزوں کے نیچے خوب صورت شمع دانوں کا ایک جوڑا ضرور رکھا جاتا تھا اور اُونچے اور پائیدار ہوتے تھے۔ ان میں کنول جیسے پھول ہوتے تھے تاکہ چربی نیچے نہ گرنے پائے۔ ہر ایک میں ایک نوک دار سُوئی لگی ہوتی تھی تاکہ موم بتی نیچے نہ گرے۔ چینی بتّیوں میں کھوکھلے سرکل کی بتّی ہوتی تھی جس میں یہ سُوئی گُھس جاتی تھی اور اُسے سیدھا رکھتی تھی۔

کچھ آگے ایک بڑھئی کی دوکان تھی جو لکڑی کے ٹب اور بالٹیاں بناتا رہتا تھا۔ مضبوطی کے لیے وہ اچھی پٹیاں اور بانس وغیرہ استعمال کرتا تھا۔ بچّوں کے لیے گھرے جُھولنے بنتے تھے جن میں تو شک وغیرہ بچھا دی جاتی تھی۔ وہ چاروں طرف سے اتنے اُونچے ہوتے تھے کہ بچہ باہر نہیں گر سکتا تھا بلکہ اُسے پکڑ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا اور باہر کی سیر کرتا تھا۔ دوکان کے پچھلے حصّے میں چھوٹی چھوٹی الماریاں رکھی رہتی تھیں۔ ان میں سے کچھ عورتوں

کے سنگاردان کا کام دیتی تھیں۔ ڈھکنا کھول کر دیکھیے تو اُن میں ایک چھوٹا سا آئینہ، کنگھا رکھنے کی جگہ، ایک چھوٹا موچنا اور کچھ پاؤڈر رکھا ہُوا ملے گا۔ دوکان کے تختے پر لکڑی کے چند خوب صورت پردے کھڑے ہوتے تھے جن پر سفید پتھّر کی مدد سے قدرتی مناظر ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چینیوں کو عرصۂ دراز سے اِس قسم کی چیزوں کا شوق رہا ہے۔ وہ انھیں فطرت کا شاہکار سمجھتے تھے۔ مجھے ایسا ہی ایک منظر یاد ہے، جس میں بھُورے، سیاہ اور نارنجی رنگوں سے پہاڑ اور کہر دکھایا گیا تھا۔ ایک آبشار پر سُورج چمک رہا تھا۔ ہر بڑھئی کی دوکان میں ساگون کی خوب صورت کُرسیاں اور اُن کے بیچ میں اچھی سی ایک میز ضرور رکھی دکھائی دیتی تھی۔ غالبًا وہ کسی دوسرے شہر سے آتی تھیں لیکن ان کے ہونے سے دوکان کی شان دوبالا ہو جاتی تھی۔

جس سڑک پر مَیں رہتی تھی اُس پر کچھ آگے بڑھ کر ایک کمہار کی دوکان تھی جو اپنا چاک گھما گھما کر بڑی اچھی شکل کے برتن تیار کرتا رہتا تھا۔ وہ چاک پر مٹّی رکھتا تھا اور اپنی ماہر اُنگلیوں سے تیزی سے برتن بنا کر اُسے ایک تختے پر رکھ دیتا تھا، جہاں سے وہ آوے میں چلا جاتا تھا۔ قریب ہی تیار شدہ گھڑے، کُونڈے اور گلدان رکھے ہوتے تھے۔ بعض پر سُرخ اور بعض پر سبز رنگ پھرا ہوتا تھا۔ مَیں نے مٹّی کی ہانڈیاں اور اُن کے ڈھکن بھی دیکھے۔ کمہار کو کام کرتے دیکھ کر بڑا لطف آتا تھا۔ دوکان کے ایک کونے میں مٹّی کی مورتیوں کی الماری کھڑی تھیں۔ کچھ مورتیاں بعض دیوتاؤں کی تھیں اور کچھ گڑیاں ہوتی تھیں۔

دہی فروش دہی کے قتلے کاٹ کر ایک گیلے کپڑے پر پھیلا دیتا تھا، جہاں وہ چمکتے رہتے تھے۔ اُس کے پیچھے مسالے دار دہی رکھی ہوتی تھی جو کھانوں کا ذائقہ بڑھاتی ہے۔ مرچ دار سُرخ دہی کے ٹکڑے عام طور پر ناشتے میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مٹر کی چٹنی گھڑوں میں بھری ہوتی تھی جس کی تیاری میں بڑی مہارت درکار ہوتی

ہے۔ اس کے لیے خاص قسم کے پانی اور خمیر کی ضرورت پڑتی ہے۔ سارے چین میں کھانے پر یہ چٹنی ضرور استعمال کی جاتی ہے۔ مَیں اکثر دیکھا کرتی تھی کہ کوئی بچّہ دہی کے دو ٹکڑے خریدنے آیا اور دوکاندار نے انھیں احتیاط کے ساتھ کنول کے خشک پتّے پر رکھا جو کاغذ کا کام دیتا تھا۔ غالباً دہی بنانے والے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ چینی لوگ نبلتاتی دودھ کو کس قدر پسند کرتے ہیں۔ اس میں پھٹکری ملا کر دہی تیار کی جاتی تھی۔ یہ دودھ بُوڑھوں کے لیے اچھا سمجھا جاتا تھا لیکن بعد میں بچّوں کے کام بھی آیا، جنھیں تازہ دودھ میسّر نہ آسکا۔ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بعض غذائی اشیاء کے لیے اُسے استعمال کیا گیا۔

اُسی سڑک پر ایک گُل فروش کی دوکان بھی تھی لیکن اس کے پاس تازہ پھُول نہیں ہوتے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ چینیوں کو تازہ پھُولوں کا شوق نہیں ہوتا بلکہ بہت سے پھُول باغوں سے براہِ راست ہی فروخت ہو جاتے تھے لہٰذا اس گُل فروش کی دوکان پر صرف مصنوعی پھُول ہوتے تھے۔ وہ صرف پھُول ہی نہیں بناتا تھا بلکہ دوسرا آرائشی سامان بھی تیار کرتا تھا۔ اگر کہیں کوئی نئی دوکان کھُلتی تھی تو اُس کے سامنے کا حِصّہ ہزاروں چمکدار پھُولوں سے بھر دیا جاتا تھا۔ پھُولوں سے الفاظ تیار کیے جاتے تھے۔ شادیوں اور جنازوں کے لیے پھُولوں کے ہاروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ شہر میں جب کبھی کوئی بڑا آدمی آتا تھا تو اُس پر پھُول برسائے جاتے تھے۔

گُل فروش کی دوکان کے پچھلے حصّے میں چھوٹی چھوٹی بہت سی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ مثلاً ایک چھوٹا سا مکان تھا جس میں پُورا فرنیچر موجود تھا۔ دروازے پر ایک خادمہ کھڑی تھی، ایک کُتّا پاسبانی کر رہا تھا اور ملازم کھڑے مسکرا رہے تھے۔ یہ مکان قبر پر جلانے کے لیے تیار کیا گیا تھا تاکہ مُردے کو اگلے جہان میں یہ سب چیزیں مل جائیں۔ رکشائیں، آرام کُرسیاں اور موٹر کاریں تک موجود تھیں اور کشتیاں بھی۔ جب کوئی ماہی گیر

کوئی نئی کشتی خریدتا تھا تو وہ کشتیوں کے مندر میں کاغذ کی کشتی دریائی اژدہے کے حضور میں نذر کرتا تھا تاکہ وہ طوفانوں سے محفوظ رہے۔ یہ مندر قریبی جھیل کے ایک جزیرے پر واقع تھا۔ چھت پر کاغذ کے نوٹ ٹنگے ہوئے تھے جو قبروں پر جلائے جاتے ہیں۔ کاغذ کی قندیلیں ہر قسم اور ہر شکل کی بنائی جاتی تھیں۔ کچھ روزمرّہ استعمال کی بیضوی قندیلیں تھیں۔ اُن کو پائیدار بنانے کے لیے مومی کاغذ لگایا جاتا تھا جس سے روشنی بھی اچھی نکلتی تھی۔ اُن پر عام طور سے کوئی ایک شکل لگی ہوتی تھی جو رنگین کاغذ سے کاٹ کر قندیل پر چپکا دی جاتی تھی۔ ایسی قندیلیں بھی تھیں جو دعوتوں کے موقعوں پر روشن کی جاتی تھیں۔ ان کی شکل موٹے سفید خرگوشوں، بطخوں، کنول کے پھولوں، کیکڑوں، چمگادڑوں، جیسی ہوتی تھی۔ کچھ قندیلوں میں پہیے لگے ہوتے تھے۔ اُنھیں کھینچا جا سکتا تھا اور کچھ میں لکڑی کی ڈنڈی لگی ہوتی تھی۔ جب یہ قندیلیں سڑکوں پر روشن کی جاتی تھیں تو رات جگمگا جاتی تھی۔ اس دوکان پر چھتریاں بھی بکتی تھیں۔ بڑی بڑی چھتریاں سادہ ہوتی تھیں اور بعض چھوٹی چھتریوں پر پھول بنے ہوتے تھے۔ یہ چھتریاں بانس کی کھپچیوں پر کاغذ چڑھا کر بنائی جاتی تھیں۔ کاغذ پر بار بار تیل پھیر دیا جاتا تھا تاکہ اُس پر پانی اثر نہ کرے۔

ایک آدمی مٹھائی اور کھلونے بیچا کرتا تھا۔ وہ کسی سایے دار جگہ بیٹھ جاتا تھا، اور اپنی پیپنی سے طرح طرح کی آوازیں نکالا کرتا تھا۔ تمام پیپنیاں ایک بانس میں لگی ہوتی تھیں جسے وہ اُٹھائے پھرتا تھا۔ بہت سی پیپنیاں اژدھے کی شکل کی ہوتی تھیں اور تقریباً سب پر بڑے خوب صورت رنگ لگے ہوتے تھے۔ جب وہ اُٹھ کر چلتا تھا، تو بہت سے بچّے اس کے پیچھے ہو جاتے تھے اور اس کا تماشا دیکھتے تھے۔ جب کوئی بچہ پیپنی بجاتا تھا تو اس کی آواز پہلے پہل اچھی نہیں نکلتی تھی۔ دن چھپے سڑک سے ایک نابینا شخص پیپنی بجاتا نکلتا تھا۔ اس کی آواز اچھی ہوتی تھی۔ وہ ساتھ ساتھ

کچھ گاتا بھی جاتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر بچہ مٹھائی اور کھلونے بیچنے والے کی آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور اس کے پیچھے دوڑتا تھا۔ وہ خستہ تل شکریاں یا ریوڑیاں بیچا کرتا تھا۔

الغرض اس سڑک پر ہر طرح کی دوکانیں تھیں اور ہر قسم کا کاروبار ہوتا تھا۔ مَیں جانتی تھی کہ جس دن چین میں صنعت و حرفت کو فروغ ہؤا، اُسی دن اِن تمام اوزاروں کی جگہ مشینوں کی آوازیں سنائی دینی شروع ہو جائیں گی۔ غالباً اس وقت زیادہ لوگوں کی ضروریات پوری ہوں گی لیکن دستی ہنرمندی اور ماہردست کاروں کا وجود ختم ہو جائے گا۔

قدیم چین کی دوکانداری

ایک دن مَیں تھوڑا سا ریشمی کپڑا خریدنے کے لیے ایک دوکان پر گئی۔ دوکان اُونچی تھی۔ جیسے ہی مَیں نے اندر قدم رکھا، دوکان کا منشی جس نے ڈھیلا چوغہ پہن رکھا تھا، اپنی جگہ سے اُٹھا اور جُھک کر کہنے لگا" سب خیریت ہے؟" وہ کہہ سکتا تھا" کیا خاتون کا مزاج اچھا ہے؟" یا" خاتون نے کھانا کھایا ہے؟" لیکن چونکہ اس حصۂ ملک میں اکثر لڑائیوں اور قزاقوں کا خوف رہتا تھا، اِس لیے پہلی ملاقات میں امن و خیریت کی بات ہوتی تھی۔ مَیں نے جُھک کر اثبات میں جواب دیا۔ تو اُس نے ایک کُرسی پیش کی۔ یہ دو کُرسیاں دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں اور دونوں کے درمیان چائے کی میز تھی۔ منشی نے تالی بجائی، تو ایک لڑکا دوڑتا ہؤا آیا۔"چائے" منشی جی نے کہا۔" گرم چائے، صاف پیالیاں لانا" لڑکا ننگے پَیر بھاگتا چلا گیا۔

مَیں کُرسی پر بیٹھ گئی۔ میری نگاہ بُوڑھے منشی کے پیچھے رکھی ہوئی الماری پر جمی تھی، جس میں ریشمی تھان رکھے ہوئے تھے۔ بُوڑھا منشی آرام سے بیٹھ گیا

اور اُس نے اِدھر اُدھر کی خبروں، موسم اور میرے بال بچوں، سبزیوں کی قسموں، چاول کی قیمت وغیرہ کی باتیں شروع کر دیں۔ مَیں بھی جواب دیتی رہی لیکن یہ سوچتی رہی کہ دیکھوں مطلب کی بات کہنے کا موقعہ کب ملتا ہے؟

اتنے میں چائے آ گئی۔ بوڑھے نے خود چائے انڈیل کر دونوں ہاتھوں سے پیالی مجھے پیش کی اور تب نہایت لجاجت سے یہ سوال کیا کہ کیا میرا ارادہ کچھ کپڑا خریدنے کا ہے۔ مَیں نے اثبات میں جواب دیا۔

پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ "کیا کپڑا کسی کو تحفتاً دینا ہے"؟ جی ہاں۔ "بچّے کے لیے یا بڑے کے لیے؟" بچّے کے لیے۔ "بچّے کی عُمر کیا ہے؟ لڑکا ہے یا لڑکی؟" لڑکا جو حال ہی میں پیدا ہُوا ہے۔ "کس مہینے میں پیدا ہُوا ہے؟ اچھا اچھا تب تو آڑو کے رنگ کی ساٹن مناسب رہے گی جس پر پھُول بنے ہوں۔ اُس نے پیچھے جا کر ایک الماری کھولی لیکن کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے ایک اور منشی کو آواز دی، جوان عُمر کا ایک آدمی آیا۔ اُس نے بہت سی گرد جھاڑی اور ریشم کے تھان نکالنے شروع کیے جو بانس کے ڈنڈوں پر لپیٹے ہوئے تھے۔ اس نے تیزی سے سب تھان میرے سامنے پھیلا دیے۔ کچھ ریشم تھا اور کچھ ساٹن، لیکن سب کے سب مغربی ممالک میں بننے والے ریشمی کپڑوں سے کہیں زیادہ خوب صورت تھے۔ جب دوکان بھر گئی تو بوڑھے نے سب کپڑوں کو ایک ایک کر کے دیکھنا شروع کیا۔

"یہ یا یہ یا یہ" اُس نے تین چمک دار تھان نکالتے ہوئے کہا۔

میری پسند کے کچھ اور رنگ بھی تھے، لیکن مَیں نے بُوڑھے کے انتخاب کو ترجیح دی کیونکہ مجھے یہ کپڑا ایک بچّے کے لیے ایک ماں کو تحفتاً دینا تھا۔ چینی بچوں کے سنہرے رنگ پر چمک دار کپڑے بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مَیں نے گلابی رنگ کا کپڑا منتخب کیا۔

"یہ خاتون یہ کپڑا پسند کر رہی ہیں۔" بُوڑھے نے دوسرے منشی سے کہا اور باقی تمام کپڑے ایک طرف کر دیے۔

"آپ کو کتنے فیٹ کپڑا چاہیے؟" اس نے پُوچھا۔

"آپ کی رائے میں کتنے فیٹ ہونا چاہیے؟" مَیں نے دریافت کیا۔

"عام طور سے چار فیٹ کافی ہوتا ہے۔" اُس نے کہا۔

دوسرے منشی نے بانس کے گز سے چار فیٹ کپڑا ناپا اور قینچی اُٹھائی۔ مَیں دیکھ رہی تھی۔ کپڑا خریدتے وقت یہ لمحہ نازک ہوتا ہے۔ یہی موقع ہوتا ہے، جب کسی گاہک یا دوکاندار کے اچھا یا بُرا ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ فوراً ہی بُوڑھا اپنی جگہ سے اُٹھا اور اُس نے جُھک کر دوسرے منشی کے کان میں کچھ کہا۔ منشی نے فوراً چار انچ کپڑا فالتو دے دیا۔

مَیں جُھکی اور مسکراتے ہوئے میں نے کہا۔ "بڑے میاں بہت ہی خلیق ہیں۔"

"جی نہیں۔ کچھ نہیں۔" اُس نے کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ گلابی رنگ کی اس ساٹن میں بچے کی ماں اُس کے لیے نہ صرف ایک لمبا کوٹ بنا سکتی ہے بلکہ دو جوڑ چھوٹے چھوٹے بھی بن جائیں گے۔ بوڑھے نے مجھے اُتنا کپڑا فالتو اس لیے دے دیا تھا کہ مَیں اکثر اس کی دوکان سے کپڑا خریدتی تھی۔

بزاز نے یہ کپڑا ایک مربّع کاغذ میں لپیٹ دیا جس پر بڑے بڑے حروف میں دوکان کا نام لکھا ہُوا تھا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اتنا اچھا کپڑا کس دوکان پر فروخت ہوتا ہے۔ آج کے چین میں اس قسم کے کاموں کی کسی کو فرصت نہیں۔

کپڑے کی ایسی دوکانوں کی بجائے اب وہاں نئے طرز کے اسٹور کُھل گئے ہیں۔ اسی طرح دواؤں کی پُرانی دوکانوں کی جگہ نئے طرز کی دوکانوں نے لے لی ہے لیکن سُننے میں آیا ہے کہ چین کی کیمونسٹ حکومت مغربی دواؤں کے علاوہ قدیم چینی دوائیں بھی

استعمال کرا رہی ہے۔

جب میرا بچپن تھا اور مَیں چین میں رہتی تھی تو میری بوڑھی آیا بعض جڑی بوٹیاں گھونٹ کر پیا کرتی تھی جو دیکھنے میں بہت بُری معلوم ہوتی تھیں، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ بعض اہم طبّی دریافتوں کا سہرا چین کے سر ہے۔ مثلاً چین میں اب سے ڈیڑھ ہزار برس پہلے چیچک کے ٹیکے لگائے جاتے تھے۔ کیولین، یومینول اور ایلفیڈرین وغیرہ سب کی سب چینی دوائیں ہیں۔

چنگ خا کے اِس قریبی شہر میں کمیونسٹوں سے پہلے مجھے ایک دوکان پر جا کر بڑی خوشی ہوتی تھی جو جھیل کے نزدیک واقع تھی۔ اس کی دیواروں پر چند تصویریں اور طغرے لٹکے رہتے تھے جن پر خوشخط عبارت کے علاوہ کچھ خوب صورت مناظر بھی بنے ہوتے تھے۔ مَیں سمجھتی تھی کہ دوکان کا مالک کوئی فن کار ہوگا۔

ایک دن مَیں ایک تصویر خریدنے کے لیے اُس دوکان پر گئی جو بعد مَیں اپنی ایک عزیز سہیلی کو تحفتاً دینا چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے جو تصاویر دکھائیں، وہ مجھے کوئی خاص پسند نہیں آئیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اور تصویریں نہیں ہیں۔ اس نے میز کی درازیں دیکھیں بھالیں۔ ان میں بھی کچھ نہ نکلا تو میری نظر اتفاق سے ایک تصویر پر جا پڑی، جو کچھ کھلی تھی اور کچھ بند۔ مجھے بانس اور تتلیاں دکھائی دیں۔

"کیا مَیں وہ تصویر دیکھ سکتی ہوں؟" مَیں نے جلدی سے پُوچھا۔

"وہ — وہ تو بے کار ہے۔" اُس نے ایک نہایت پُرانی سی تصویر نکالتے ہوئے کہا: "یہ موٹے کاغذ پر چپکانے کے قابل نہیں ہے۔"

یہ تصویر بڑی نازک تھی — ہلکے سبز، نارنجی، سیاہ اور گلابی رنگوں کے امتزاج نے بڑا اچھا مرقّع پیش کیا تھا۔ اوپر سے بانسوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔ پھولوں پر تتلیاں گھوم رہی تھیں۔ مَیں حیران رہ گئی لیکن مَیں نے اپنی پسندیدگی کو زیادہ ظاہر نہیں

ہونے دیا۔

"اگر آپ ذرا احتیاط کے ساتھ اِسے موٹے کاغذ پر چپکا دیں ——" مَیں نے کہا۔

"یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ مغربی دروازے کے باہر جو زرد مندر ہے، اُس کے راہب نے یہ تصویر بنائی تھی۔ وہ کوئی مشہور آدمی نہیں تھا۔"

مَیں نے تصویر کو اور غور سے دیکھا۔ اس میں کوئی خامی نہیں تھی۔ بڑی شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ "آپ اسے کاغذ پر چپکا دیجیے۔ اگر اچھی معلوم نہ ہوئی تو مَیں آپ کی مزدوری ادا کر دوں گی۔"

"نہیں نہیں۔ مَیں ایسی تصویر اپنی دوکان سے فروخت کرنا نہیں چاہتا۔"

"مَیں کسی سے نہیں کہوں گی کہ کہاں سے خریدی ہے۔"

"مگر یہ اچھی تصویر نہیں ہے —— بالکل خراب ہے۔"

"اس کی کیا قیمت ہو گی؟" مَیں نے اصرار سے پُوچھا۔

دوکاندار کی آنکھوں میں عجیب سی روشنی پیدا ہوئی۔ مَیں نے غور سے اُس کو دیکھا۔ اس کی ٹوپی ٹیڑھی تھی۔ اس نے کانپتی انگلیوں سے تصویر کو لپیٹنے کی کوشش کی۔

"مہربانی کرکے آپ اسے کاغذ پر چپکا دیجیے، مَیں تب دیکھوں گی۔" مَیں نے منت سے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ تصویر میری سہیلی کو پسند آئے گی۔"

"ایک ہفتہ بعد آئیے۔" اُس نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یکایک کچھ ناراض ہو گیا ہے۔ اُسے روپے کی ضرورت تھی لیکن وہ اپنی دوکان کا وقار برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

مَیں ایک ہفتہ بعد پھر اُس کی دوکان پر گئی لیکن جیسا کہ مجھے امید تھی، وہ تصویر دیوار پر ٹنگی نظر نہ آئی۔ مَیں نے سوچا کہ کیا واقعی وہ اُسے فروخت نہیں کرنا چاہتا۔

"کیا بانسوں اور تتلیوں والی تصویر ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟" مَیں نے سلام دعا کے تکلفات کے بعد کہا۔

"ہوگئی، ہوگئی۔" اُس نے ذرا خشکی کے ساتھ جواب دیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ اسی تصویر پر کیوں اصرار کر رہی ہیں۔ اب میرے پاس بانس اور تتلیوں کی ایک اور تصویر بھی آگئی ہے۔ اس سے بھی اچھی، مَیں آپ کو ابھی دکھاتا ہوں۔ اُس نے دراز کھول کر ایک تصویر نکالی اور میرے سامنے پھیلا دی۔

"لیکن یہ تصویر اُس جیسی بالکل نہیں۔" مَیں نے کہا۔ "یہ تو کسی دوسرے مصوّر کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کا ہاتھ بھی بھاری ہے اور رنگ بھی زیادہ بھڑکیلے ہیں۔ یہ تو مجھے بالکل پسند نہیں۔

"یہ تو بالکل اسی جیسی ہے۔" اس نے جز بز ہو کر کہا۔

"غلط۔" مَیں نے کسی قدر جھنجھلا کر جواب دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دوکاندار اپنی چیز بیچنا کیوں نہیں چاہتا۔

"اچھا اگر آپ کو وہی تصویر درکار ہے تو لیجیے یہ رہی۔" اُس نے تختے کے نیچے سے وہ تصویر نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" مَیں نے اس کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا۔ اس نے تصویر کو بڑی احتیاط سے موٹے کاغذ پر چپکایا تھا۔ کہیں کہیں اس کی مرمّت بھی کر دی تھی۔ اب وہ اور بھی زیادہ خوب صورت معلوم ہو رہی تھی۔

"کیا قیمت ہے؟" مَیں نے آہستہ سے پُوچھا۔

"پانچ ڈالر۔" اُس نے جواب دیا۔ کیا مَیں نے ٹھیک نہیں سُنا؟ مَیں تو سوچ رہی تھی کہ وہ اس سے تین گنی قیمت بتائے گا۔

اس کے بعد اُس نے جلدی جلدی بولنا شروع کیا۔ "آپ جو مناسب سمجھیں دے

دیکھیے، کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے کہا اور کچھ اور کام کرنے لگا جیسے اُسے اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں۔

"میرے خیال میں آپ یہ تصویر فروخت کرنا نہیں چاہتے۔" مَیں نے اُس سے کہا۔ مَیں اُس کے برتاؤ سے یہی نتیجہ اخذ کرسکتی تھی۔

" مجھے یہ تصویر بہت پسند ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

" تو مَیں اِسے آپ سے نہیں لوں گی۔"

"نہیں۔" اُس نے مختصراً کہا۔ مَیں نے یہ آپ کے لیے ہی کاغذ پر چپکائی ہے، لے لیجیے۔"

اِس کے بعد اس نے تصویر پر کاغذ لپیٹ دیا اور ڈوری باندھ کر مجھے دے دی۔

"مجھے افسوس ہے کہ میری سمجھ میں یہ بات پہلے نہیں آئی۔" مَیں نے کہا۔

"آپ کی سہیلی کو بھی یہ تصویر اتنی ہی پسند آئے گی۔" اُس کی آنکھوں میں یکایک چمک پیدا ہو گئی۔

"ہاں مجھے یقین ہے۔ اِسی وجہ سے تو مَیں اسے لینا چاہتی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ مَیں بھی یہ تصویر کسی ایسے گاہک کو نہیں دینا چاہتا تھا جو اسے لے جا کر بس دیوار پر لگا دے۔" اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ تعظیماً جُھکا اور دوکان کے پچھلے حصّے میں چلا گیا۔ اس نے تصویر کی قیمت بھی نہیں اُٹھائی۔ وہیں تختے پر پڑی رہنے دی گویا وہ بے کار تھی۔

عوامی ملازم

پُرانے چین میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جنھیں عوام کا خادم کہا جا سکتا ہے۔ غالباً نئی حکومت کے تحت اُن کا وجود ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم یہاں دو ملازمین کا ذکر کرتے ہیں۔ خطوط نویس اور گرم پانی فروخت کرنے والا۔

ایک سڑک کے سایہ دار گوشے میں ایک شخص ٹوپی اوڑھے بیٹھا ہے۔ اُس کے سامنے ایک میز ہے جس پر چند بُرشی قلم ایک پیالی میں رکھے ہوئے ہیں۔ روشنائی کو پانی میں ملانے کے لیے ایک تختی رکھی ہے، پانی کی بوتل ہے اور خط لکھنے کا کاغذ۔ جب اُسے کوئی کام نہیں ہوتا تو وہ چھوٹی سی ایک کتاب پڑھنے لگتا ہے لیکن اب ایک عورت آگئی ہے جو غالباً لکھنا پڑھنا نہیں جانتی۔ وہ خط لکھوانا چاہتی ہے۔ اپنے چوغے کا کونا اُنگلی پر پیٹتی جاتی ہے اور سوچتی جاتی ہے کہ کیا لکھوانا ہے۔ خط نویس پہلے القاب و آداب لکھے گا، پھر پُرتکلّف زبان میں اس کی بتائی ہوئی باتیں تحریر کرے گا اور اُسی طرح خط کو ختم کرے گا۔ وہ عورت کی بات غَور سے سُنتا ہے، اُس سے ایک دو سوالات پُوچھتا ہے اور پھر ایک خاص انداز سے قلم پکڑ کر لکھنا شروع کرتا ہے۔ وہ اوپر نیچے نہایت خوب صورت الفاظ بناتا جاتا ہے۔ ہر لفظ اپنی جگہ ایک تصویر ہے۔ الفاظ کی قطاریں بنتی جارہی ہیں اور عورت خوشی سے دیکھ رہی ہے، خط ختم ہو جاتا ہے۔

خط کو بند کرنے سے پہلے خط نویس اُسے پڑھتا ہے تاکہ اگر کوئی بات رہ گئی ہو، یا عورت کچھ اور لکھوانا چاہے تو وہ بھی شامل کرلیا جائے۔ وہ مسکراتی ہے اور کسی جملے کا مطلب پوچھتی ہے۔ خط نویس خط ختم کرکے خشک ہونے کے لیے ایک طرف رکھ دیتا ہے اور لفافے پر پتہ لکھنے لگتا ہے۔ اگر خط کسی گاؤں میں کسی مشہور آدمی کی معرفت جارہا ہے تو پتہ کافی طویل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مقام کا نام یوں لکھا جاتا ہے۔ "وہ گاؤں جو اکیلے صنوبر والے مندر کے قریب واقع ہے۔" یا "اُس چشمے پر جو بانسوں کے جنگل کے باہر شرقاً غرباً بہتا ہے۔" اب خط سُوکھ گیا ہے۔ اُسے تہہ کرکے لفافے میں بند کردیا گیا۔ عورت نے اپنے کوٹ کی گہری جیب سے چند سکے نکالے اور اس کے حوالے کردیے۔ چین کے تقریباً ہر گاؤں اور قصبے میں اِس قسم کے

خطوط نویس ہوتے تھے۔

سوائے جدید شہروں کے چین میں پانی کو صاف کرنے اور ٹنکیوں میں ذخیرہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ دیہاتوں میں دریاؤں، نہروں، تالابوں، چشموں اور کنوؤں کا پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ گندگی کے اخراج کے لیے زمین دوز نالیوں کا رواج بھی نہیں ہے۔ اگر چینی سرد پانی پینے کے عادی ہوتے تو اُن کی صحت خطرے میں پڑ جاتی۔ وہ ہزاروں سال سے گرم چائے پیتے آئے ہیں اور اِس خطرے سے محفوظ رہے ہیں۔ زیادہ تر گھروں میں سادے چولھے ہوتے ہیں جن پر ایک وقت میں بہت سا پانی گرم نہیں کیا جا سکتا۔ گرم پانی کی ٹنکیوں کا بھی کوئی بندوبست نہیں، اس لیے گرم پانی بھی دوسری اشیاء کی طرح فروخت ہوتا ہے۔

چین کی کسی سڑک پر چلتے ہوئے اکثر ایک بچّے کی آواز آتی ہے۔ "بچو۔ بچو۔" پیدل چلنے والے خود بخود ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ بچّہ لکڑی کی بالٹی میں کونے کی دوکان سے گرم پانی لا رہا ہے۔ اس کی ماں کپڑے دھوئے گی۔ دوکان پر بڑے بڑے دیگچوں سے گرم پانی کھولتا رہتا ہے۔ دوکاندار بانس کی ڈوئچیوں سے اُسے نکال نکال کر بیچتا رہتا ہے۔ کچھ دیگچوں میں گرم پانی ہوتا ہے۔ کچھ میں کھولتا ہُوا پانی ہوتا ہے جو چائے بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پہلے سقّے پانی لاتے تھے۔ وہ بھی عوامی ملازم ہوتے تھے۔ شہر کا ہر شخص پانی کے لیے تالاب یا دریا پر نہیں جا سکتا۔ یہ کام سقّے کرتے ہیں اور مہینے پر اپنی اجرت لے لیتے ہیں۔ صحن کے گوشے میں گھڑے رکھے ہوتے ہیں۔ سقّے انھیں بھر جاتے ہیں۔

گھر کے صحن میں آگ جلتی رہتی ہے۔ اس پر ایک کیتلی رکھی ہوتی ہے جس میں پانی کھولتا رہتا ہے۔ بعض لوگ چائے بنانے کے لیے بھی دوکان سے پانی خریدتے ہیں۔

چائے کا پورے چین میں رواج ہے۔ اس کی بدولت لاکھوں آدمیوں کی جان محفوظ رہی ہے۔ بوڑھے اور بچے سب کے سب اُبلا ہُوا پانی پیتے ہیں لیکن مہمانوں کے سامنے چائے پیش کی جاتی ہے۔ گھر والے بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد چائے کی پیالی بناتے اور پیتے رہتے ہیں۔ مزدور خواہ کتنا بھی تھکا ہُوا اور پیاسا کیوں نہ ہو، وہ چشمے کا پانی نہیں پیئے گا۔ اس کے پاس چائے دانی موجود ہوگی۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی ہو گی لیکن پیاس بجھائے گی۔

پُرانے چین میں چائے کی دوکان دوستوں سے ملنے کی جگہ سمجھی جاتی تھی۔ جب لوگ سودا سلف خرید چکتے تھے یا کسان اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتا تھا یا دو دوست آپس میں کوئی کاروباری گفتگو کرنا چاہتے تھے تو وہ چائے کی دوکان پر بیٹھ جاتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں سامنے کا پُورا حِصّہ کھُلا رہتا تھا اور چائے کی دوکانوں پر اتنا شور ہوتا تھا کہ سڑک پر دُور دُور تک سُنا جا سکتا ہے۔ جاڑوں میں گرم چائے، لوگوں کا ہجوم اور ایک انگیٹھی دوکان کو اندر سے خوب گرم رکھتی تھی۔ دوکان کے ملازم چائے دانی اور پیالیاں اُٹھائے اِدھر اُدھر دوڑتے رہتے تھے۔ قہوہ خانے سے زیادہ رونق اور کہیں نہیں ہوتی تھی۔

کھانا پکانا

شمالی چین کے لوگ زیادہ تر گیہوں یا باجرے کی روٹی اور دوسری چیزیں کھاتے پکاتے ہیں۔ روٹی کے علاوہ سبزیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ جنوبی حصّے کی خاص غذا چاول ہے۔ اس کے علاوہ گوشت اور سبزیاں بھی کھائی جاتی ہیں لیکن سب کے پکانے کا طریقہ بہت کچھ ایک جیسا ہی ہے۔ بھینس، بھیڑ، مُرغی کے گوشت کے علاوہ مچھلی بھی کھائی جاتی ہے۔ دہی کی کئی قسمیں استعمال کی جاتی ہیں اور مٹر کی چٹنی سارے

چین میں عام ہے۔ انڈے نہایت قوّت بخش غذا سمجھے جاتے ہیں۔ عیادت کے وقت دس تازہ انڈے یا ایک مُرغی بہترین شمار کی جاتی ہے تاکہ بیمار اُس کی یخنی پی سکے۔

بعض چینی کھانے نہایت گراں قیمت ہوتے ہیں لیکن ان کا کوئی ذائقہ نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو اتنا لطیف کہ اُسے پکاتے وقت نکھارنا پڑتا ہے۔ شارک مچھلی کے گلپھڑوں کا شمار چین کے بہترین کھانوں میں ہوتا ہے۔ اُن میں چربی زیادہ ہوتی ہے اور ان کا لطف اُس وقت تک نہیں آتا جب تک انھیں صحیح مسالوں کے ساتھ ٹھیک طور پر نہ پکایا جائے۔ وہاں ابابیل کی قسم کی ایک چڑیا ہوتی ہے جو گھونسلا بناتے وقت اپنے منہ سے گوند کی طرح کی کچھ رطوبت نکالتی ہے۔ اس کا گھونسلا مرغی کے گوشت میں پکایا جاتا ہے۔ بعض سفید اور سیاہ کھمبیاں بھی گوشت میں پکاکر کھائی جاتی ہیں اور اچھی سمجھی جاتی ہیں۔

چین میں کھانا پکانے کو ایک فن کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی وجہ غالبًا غذائی قلّت ہے۔ عرصۂ دراز تک لوگوں کو وافر غذا نہ ملی، اس لیے جو کچھ اُن کے ہاتھ آیا، اُسے انھوں نے طریقے سے پکانا سیکھا۔ شاید غذائی قلّت کی وجہ سے ہی یہ بات بھی مشہور ہوگئی کہ چینی باشندے چوہے اور سانپ کھاجاتے ہیں لیکن مَیں نے کہیں یہ نہیں دیکھا، سوائے اس کے کہ ملک کے بعض حصّوں میں سانپ کی بعض قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ مَیں نے سُنا ہے کہ ان کا گوشت بالکل مُرغی جیسا ہوتا ہے۔

ناشتے پر عام طور سے سوّیاں یا چاول یا باجرے کا دلیا کھایا جاتا ہے۔ ساتھ میں مسالے دار بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ خواہ مٹر کا اچار ہو یا مرچ دار دہی ہو یا سرکے میں پڑی ہوئی مرچیں ہوں۔ کبھی کبھی نمکین مچھلیاں اور دوسرے اچار چٹنیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ صبح کا وقت بھوک تیز کرنے کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے، اسی لیے یہ چیزیں کھائی جاتی ہیں۔ یہ لوگ ناشتے پر میٹھی چیزیں کھانا پسند نہیں کرتے۔ اُن سے

بُھوک مر جاتی ہے۔

رات کے کھانے پر اکثر اوقات تین مختلف قسم کی سبزیاں اور گوشت استعمال کیا جاتا ہے۔ ساتھ میں یخنی بھی ہوتی ہے۔ سبزیوں میں گوبھی زیادہ عام ہے۔ مچھلی، ادرک پیاز اور چٹنی کے ساتھ سالم پکائی جاتی ہے۔ اسی طرح دہی کو بھی کئی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی اجوائن کے ساتھ اور کبھی مرچوں کے ساتھ۔ یخنی ہر طرح کی ہڈّیوں سے تیار کر لی جاتی ہے۔ ذائقے کے لیے ایک دو اور چیزیں ڈال دی جاتی ہیں۔

کھانے کے پیالے ننگی میز کے بیچ میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ایک بالٹی میں سے ضرورت کے مطابق چاول نکالتا رہتا ہے۔ لکڑی یا ہاتھی دانت کی چھوٹی چھوٹی تیلیاں پیالوں سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ ان کی مدد سے ہی وہ دوسری پلیٹوں سے اپنی پسند کی چیزیں اُٹھاتے رہتے ہیں اور مزے لے لے کر کھاتے رہتے ہیں۔ چین میں قدیم رواج یہ تھا کہ لذیذ چیزیں ہونٹوں سے آواز پیدا کر کے کھائی جاتی تھیں۔ اگر کوئی شخص چُپ چاپ کھانا کھاتا تھا تو اِس کا مطلب یہ سمجھا جاتا تھا کہ کھانا لذیذ نہیں ہے۔ کھانا ختم ہونے پر ہر شخص گرم گرم پانی سے نکلے ہوئے تولیے سے اپنا ہاتھ مُنہ صاف کر لیتا ہے۔

دعوت کے وقت خاص اہتمام کیا جاتا ہے اور تیس تک مختلف کھانوں کے دَور چلتے ہیں۔ ایسے موقعے پر کسی ہوٹل والے کی خدمات طلب کر لی جاتی ہیں کیونکہ اکثر گھروں میں دعوتیں دینے یا زیادہ آدمیوں کے لیے کھانا تیار کرنے کا انتظام نہیں ہوتا۔

ہم نے یہاں جو کچھ لکھا ہے اُس سے چین کے بہترین کھانے مراد ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں کو مشکل ہی سے پیٹ بھر کھانا میسّر آ سکا ہے۔ ہزاروں آدمی ایسے ہیں جنھیں کہیں سال بھر میں ایک مرتبہ گوشت کی شکل نظر آتی تھی۔ وہ اچھی چائے تک کے ذائقے سے نا آشنا رہتے تھے۔

کمیونسٹ حکومت بھی پیداوار بڑھانے پر زور دے رہی ہے۔ اس کے باوجود چین ابھی تک غذائی قلّت کا شکار ہے۔ غلّے پر اکثر راشن رہتا ہے۔ حکومت غیر ملکی سربراہوں کی آمد یا ایسے ہی کسی دوسرے اہم موقعے پر بڑی دعوت کا اہتمام کرتی ہے، ورنہ عام طور پر بڑے بڑے افسر بھی معمولی مکانوں میں رہتے ہیں، نیلے کپڑے پہنتے ہیں اور معمولی لوگوں کی طرح سفر کرتے ہیں۔ اس قسم کی تبدیلیوں سے چین کی قدیم روایات ختم ہو گئی ہیں۔ جن لوگوں نے حالیہ چند برسوں میں چین کی سیر کی ہے انھوں نے وہاں سب کو ایک قسم کا لباس، ایک ہی قسم کا کھانا اور ایک ہی قسم کے مکانات استعمال کرتے دیکھا ہے۔ حد یہ ہے کہ پروپیگنڈے کے اثر کی وجہ سے سب کا طرزِ فکر تک ایک جیسا ہو گیا ہے۔ لاؤڈ سپیکروں سے ہر وقت یہ صدا نکلتی رہتی ہے۔ "کام ہی سب سے بڑی تفریح ہے۔"

چین کے اِس تغیرِ عظیم کی بنیاد تعلیم پر ہے۔

اسکول

شاید ہی دُنیا کا کوئی دوسرا ملک ایسا ہو جہاں عرصۂ دراز تک تعلیم کو اتنی اہمیت حاصل رہی ہو جتنی چین میں رہی ہے۔ آپ کو شاید اس تمہید پر تعجب ہو کیوں کہ ابھی حال تک وہاں اَن پڑھ لوگوں کی تعداد بہت کافی رہی ہے۔ اس تعداد کا صحیح تعین ممکن نہیں لیکن بعض حضرات کا کہنا ہے کہ شہروں میں تقریباً آدھے لوگ لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں ان کی تعداد شہروں کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ ۱۹۳۸ء میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے ایک زبردست مہم شروع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ دو سال کے عرصے میں ۴۶۰۰۰۰۰۰ لوگ پڑھنا سیکھ گئے۔

یہ تحریک صحیح معنوں میں ۱۹۲۰ء کے بعد ہی شروع ہو گئی تھی، جب ڈاکٹر ہوشی

نے جو کسی زمانے میں ریاست ہائے متحدہ امریکا میں چین کے سفیر بھی رہ چکے تھے، اپنے ملک میں "علمی احیا" کا آغاز کیا۔ اس کا منشاء یہ تھا کہ 'ون لی' یا ادبی زبان کی بجائے دیسی زبان کو فروغ دیا جائے۔ اِس سے یہ فائدہ تھا کہ لوگ برسوں کی بجائے صرف چند ماہ ہی اچھا خاصا پڑھنا سیکھ جاتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر جیمز وائی۔سی۔ ین نے بھی اس تحریک کو قوت بخشی جو ہر جگہ "جمی ین" کے نام سے مشہور ہے۔ اِس شخص نے پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں فرانس میں چینی مزدوروں کے ساتھ کچھ وقت گزارا تھا۔ وہاں اس نے اَن پڑھ لوگوں پر سادہ چینی زبان کا تجربہ کیا اور بعد میں اُسے "ہزاری نظام" کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس میں نہایت عام الفاظ شامل ہیں۔ اگر کوئی شخص انھیں یاد کرلیتا ہے تو وہ آسان کتابیں، اخبار وغیرہ پڑھ سکتا ہے، حساب کتاب رکھ سکتا ہے اور ضروری خطوط لکھ سکتا ہے۔ چین کے مختلف حصّوں میں اِس نظام کی تدریس کے لیے خاص جماعتوں کا انتظام کیا گیا اور بہت سے مردوں، عورتوں اور بچّوں کو اس کی تعلیم دی گئی۔

پُرانے چین کے اسکولوں میں صرف لڑکے پڑھتے تھے۔ لڑکیاں اسکولوں میں نہیں جاتی تھیں۔ صاحبِ استطاعت لوگ اپنی بچّیوں کو گھر پر ہی پڑھواتے تھے۔ پُرانے اسکول جدید نظامِ تعلیم سے قطعی مختلف تھے۔ ایک بُوڑھا اُستاد بچّوں پر مامور ہوتا تھا اور وہ ادبیات کی ایک ایک سطر رٹتے رہتے تھے۔ خواہ ان کی سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے۔ اگر کسی بچّے کو سبق یاد نہیں ہوتا تھا تو اُستاد کو پورا اختیار تھا کہ وہ پنکھے کی ڈنڈی اس کے ہاتھ یا سر پر دے مارے! اسکول صبح سویرے سے دن چھُپے تک جاری رہتا تھا۔

قومی انقلاب کے بعد تمام بڑے شہروں میں سرکاری اسکول کھُل گئے۔ ان کی بنیاد جدید خیالات پر رکھی گئی۔ بعض میں ابتدائی جماعتوں میں اور بعض میں اونچی جماعتوں

میں انگریزی زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ ادبیاتِ قدیم کو نصاب سے اس طرح خارج کر دیا گیا کہ بہت سے ماہرینِ تعلیم نے اس پر اعتراض کیا۔ گورنمنٹ کالجوں کی بھی جدید خطوط پر تدوین کی گئی۔ وہاں سائنس اور یورپی زبانوں کی تعلیم پر زور دیا جانے لگا۔ پیپنگ، نانکنگ، کینٹن، شنگھائی، اور چنگ شا وغیرہ میں بڑے بڑے کالج تھے۔

جاپان کے ساتھ چین کی لڑائیوں کا ایک حیرت ناک نتیجہ یہ نکلا کہ کالجوں کو ہزاروں میل دُور محفوظ مقامات پر پہنچا دیا گیا۔ راستے میں انھوں نے پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس سخت دَور میں طلبا کی تعداد کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی۔ اس واقعے سے ظاہر ہے کہ چینیوں کو علم سے بڑی محبّت تھی۔ چینی قوم پرست حکومت نے نوجوان طلباء سے جنگ کی درخواست کرنے کی بجائے انھیں یہ تلقین کی کہ وہ اپنے سکولوں میں بدستور پڑھتے رہیں اور اپنے تیئں مستقبل کا لیڈر بنائیں۔ ۱۹۳۶ء میں چینی کالجوں میں طلبا کی تعداد ۴۲،۰۰۰ تھی جو ۱۹۴۱ء میں بڑھ کر ۴۵،۰۰۰ ہوگئی۔ چین میں ایک پرانی کہاوت مشہور چلی آتی ہے: "جس طرح کیل بنانے کے لیے اچھا لوہا استعمال نہیں کیا جاتا، اسی طرح سپاہی بنانے کے لیے اچھے آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

قوم پرست دَورِ حکومت کی بہ نسبت کمیونسٹ دَور میں کہیں زیادہ ترقی ہوئی کیونکہ دونوں نظام ہائے تعلیم کے درمیان ایک خاص فرق ہے۔ اب جبر کی جگہ آزادی نے لے لی ہے۔ اب تعلیم برائے مقصد حاصل کی جاتی ہے نہ کہ برائے تعلیم یا دانش۔ چین کی یونیورسٹیوں، اَن پڑھ کسانوں اور عورتوں کو کیا ہو گیا ہے؟

پُرانا چین جاہلوں کا مُلک کہلاتا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں وہاں اسکولوں میں پڑھنے والے بچّوں کی تعداد ۱۰۰،۰۰۰،۰۰۰ تھی اور یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم طلبا کی تعداد ۰۰۰،۰۰۰ تھی۔ دنیا کی یہ مشکل زبان اب ہزاری نظام سے بھی زیادہ سہل بنا دی گئی ہے۔ اب صرف ۶۰۰ بنیادی حروف کی ضرورت پڑتی ہے۔ کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے جہالت کو

۹۰ فی صدی سے گھٹا کر ۲۰ فی صدی کر دیا ہے۔ انھوں نے اس قسم کے نعروں سے بڑی مدد لی ہے۔" ہر شخص کو لکھنا پڑھنا آنا چاہیے۔ بچّوں کو چاہیے کہ وہ اپنے والدین کو پڑھائیں۔ کسان اور عورتیں، مزدور اور دوسرے نوجوان جنھوں نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی، اب زیرِ تعلیم ہیں۔

سب سے بڑا اسکول مرکزی حکومت کا پروپیگنڈا اور اُس کا انتظام ہے۔ اہلِ چین عرصۂ دراز سے منفرد حیثیت کے مالک رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی کوئی ایسی چیز قبول نہیں کی جو انھیں پسند نہ ہو لیکن اب انھیں ہر وہ چیز پسند ہے جس کی انھیں تاکید کی جاتی ہے۔ حکومت نے کچھ اِس طرح اُن کی تطہیر کی ہے کہ اب جو کچھ اُن پر ٹھونسا جاتا ہے وہ اُسی کو قبول کر لیتے ہیں۔

جن لوگوں نے نئے چین کو دیکھا ہے اُن کا بیان ہے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا۔ کتنے ہی میدانوں میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ ۱۹۴۹ء میں پیپنگ میں صرف ایک کارخانہ تھا لیکن اب وہاں پچاس کارخانے ہیں۔ صفائی، باقاعدگی اور نظم وضبط نے قدیم بدنظمی کی جگہ لے لی ہے۔ لباس میں یکسانیت ہے۔ ہر شخص نیلا سُوتی لباس پہنتا ہے۔ ماضی میں گہرے شوخ رنگ کے کپڑے استعمال کیے جاتے تھے۔ جمہوری ممالک کی طرح اب یہاں طرح طرح کے طبقے نہیں ہیں۔ با اختیار لوگوں کو بھی عوام سے زیادہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔ چین میں پُرانے زمانے سے انعام دینے لینے کا رواج چلا آرہا تھا، لیکن اب اس کی اجازت نہیں رہی۔ کہا جاتا ہے کہ اب نوکر بھی انعام قبول نہیں کرتے۔ پہلے سودے بازی بہت ہوتی تھی لیکن اب ہر چیز کے ایک دام مقرر ہو گئے ہیں۔ قدیم چین یا تو غائب ہو گیا ہے یا ایسی نیند سویا ہے جس سے اُس کا بیدار ہونا مشکوک ہے۔ یہ قوم قدامت کو چھوڑ کر جدّت کی طرف گام زن ہے۔ صنعت وحرفت ترقی پر ہے اگرچہ آہستہ آہستہ۔ تعلیم بڑھ رہی ہے اگرچہ ذرا مختلف انداز میں۔ چین ایک

طاقت ور ملک کی حیثیت سے اُبھر رہا ہے۔

ماؤسی تنگ نئے چین کا سربراہ ہے۔ وہ ہنان کے ایک گاؤں میں ایک خوش حال کسان کے گھر پیدا ہُوا۔ چنگ شا کے اسکول میں اس کی تعلیم شروع ہوئی جو اس صوبے کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۳۰ء میں ماؤ نے چینی کیمونسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالی اور ۱۹۳۴ء میں وہ کیمونسٹ فوجوں کو اپنی سرکردگی میں جنرل چیانگ کائی شیک سے چھ ہزار میل دُور ینان کے غاروں میں لے گیا۔

ماؤ نئے چین کا لیڈر رہا ہے۔ پہلے اس نے چین کو جاپان کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے قوم پرستوں کا ساتھ دیا، پھر اُن سے جُدا ہو گیا۔ اُس نے چین کی تاریخ میں اپنا مقام پیدا کیا ہے اور اس کا شمار پیکنگ کے زعماء میں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں کیمونسٹوں کی سرکردگی میں عوامی جمہوریۂ چین کا قیام عمل میں آیا دس سال بعد ماؤ نے یہ طے کیا کہ پیداوار بڑھانے کے لیے پنچایتیں بنائی جائیں۔ وہ چینی کیمونسٹ پارٹی کا صدر ہے۔ اسی وجہ سے وہ چینی قوم کا رہنما بھی ہے اگرچہ اس عہدے پر کوئی دوسرا شخص فائز رہتا ہے۔ وہ چین کو ایک قوی اور جدید ملک بنانے کا تہیہ کر چکا ہے۔ اس کے عزم میں کسی صورت فرق نہیں آیا۔

عوامی جمہوریۂ چین کو اقوامِ متحدہ میں نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ اگرچہ قوم پرست حکومت کو یہ حق حاصل ہے جو فارموسا میں جلا وطن ہو گئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کیونکہ چین میں دُنیا کی آبادی کا چوتھائی حصّہ رہتا ہے اور فارموسا کے چھوٹے سے جزیرے میں صرف بیس لاکھ چینی بستے ہیں۔ اب یہ لوگ اپنے آپ کو چینی نہیں سمجھتے۔ اُن کے بزرگ چین سے بھاگ کر ڈھائی سَو سال پہلے یہاں آئے تھے۔ پچاس سال تک یہاں جاپان کی نوآبادی قائم رہی۔ انھوں نے اسکولوں میں جاپانی زبان پڑھی اور اُن کی ثقافت چینی کی بجائے جاپانی ہو گئی۔ قوم پرست

حکومت کے عہدہ دار بوڑھے اور کمزور ہو چکے ہیں، حالانکہ امریکا اُسے اور اُس کی فوج کو برابر امداد دیتا رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے ۱۹۱۱ء کے چینی انقلاب میں وفاداری کا ثبوت دیا تھا۔ یہ جمہوریت کی طرف ایک مؤثر قدم تھا۔ فارموسا کے قوم پرست ابھی تک چین واپس جانے اور اُسے کمیونسٹوں سے چھین لینے کا خواب دیکھتے رہتے ہیں لیکن جنرل چیانگ کائی شیک کے علاوہ کم لوگ یہ بات ممکن سمجھتے ہیں۔ وہاں کے نوجوان جزیرے کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کا رُخ کر رہے ہیں جہاں وہ اپنی قابلیت کو بہتر طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ چین کو واپس جانے کے مواقع ہر سال کم ہوتے جا رہے ہیں۔

بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ میں جلاوطن حکومت کو نمائندگی حاصل ہونی چاہیے یا چین کی حکومت کو۔ اوّل الذکر میں مُٹھی بھر چینی شامل ہیں جنھیں یہ جزیرہ نہیں اپناتا۔ اگرچہ وہ کہتے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے وہ چینی ہے۔ موخر الذکر حکومت دُنیا کی ایک چوتھائی آبادی پر مشتمل ہے۔

اصل مسئلہ کمیونزم کا ہے۔ قوم پرست اور فارموسا والے اُس سے نفرت کرتے ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں۔ اِن احساسات ہیں وہ قوّتیں بھی شریک ہیں، جو اقوامِ متحدہ میں چین کی کمیونسٹ حکومت کی مخالفت کرتی ہیں۔ کمیونسٹ چین دُنیا کی ایک عظیم قوّت ہے۔ اُس کے اقوامِ متحدہ میں شامل ہو جانے سے سیکیورٹی کونسل میں آرا کا توازن بگڑ جائے گا۔ حقِ تنسیخ سے جمہوریت کو اور زیادہ خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر اقوامِ متحدہ میں قوم پرست چین کی بجائے کمیونسٹ چین کو نمائندگی مل گئی، تو دنیا کی اقوام مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گی۔ اگرچہ زیادہ تر لوگ اس بات کے حق میں ہیں کہ دنیا کی اس عظیم آبادی کو اس بین الاقوامی جماعت میں نمائندگی ملنی چاہیے تاہم کچھ لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر عوامی جمہوریۂ چین کو یہ نمائندگی مل گئی

تو عالمی امن کا نازک توازن خراب ہو جائے گا۔ اِس حکومت کی ترقی کی بنیاد مرکزی اقتدار، دباؤ، خوف، مغربی اقوام کے خلاف پروپیگنڈے اور قوی فوج پر استوار ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چین عالمی امن میں کتنی دلچسپی رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اب جلد ہی چین کے کروڑوں انسانوں کو اقوامِ متحدہ میں نمائندگی حاصل ہو جائے کیونکہ کوئی بھی عالمی انجمن دُنیا کی اتنی کثیر آبادی کو زیادہ عرصے تک نظر انداز نہیں کر سکتی۔

گیارھواں باب

چینی آرٹ

چینیوں کے اقوال بڑے قدیم زمانے سے مشہور چلے آتے ہیں۔ دُور دراز مُلکوں کے لوگ اُن کی باتیں سُننے کے لیے اب سے دو ہزار سال پہلے خشکی اور تری کے خطرناک راستوں سے گذر کر اُن کے مُلک تک پہنچتے تھے۔ اُن کے اقوال نہایت خوب صورتی اور نفاست کے ساتھ ظاہر کیے جاتے تھے —— ریشم جو اس وقت تک دُنیا کے کسی دوسرے مُلک میں تیار نہیں کیا جاتا تھا، مسالے جو کہیں اور نہیں پیدا ہوتے تھے، چینی مٹّی کے نہایت خوب صورت برتن، روغن جو بڑی مشکل سے بنتا تھا اور پتھر، ہاتھی دانت کی تراشیدہ مورتیں یہاں کے کمالات میں شمار ہوتی تھیں۔ مغرب کے سیاح اِن کمالات کو صرف چھُونے کی غرض سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر یہاں تک پہنچتے تھے۔

چینی پہلی قوم ہے جس نے آرٹ کے ذریعے اپنے جذبات کی ترجمانی کی۔ ان کی موسیقی قدیم ترین ہے۔ ریکارڈ کے مطابق چینی موسیقی کی ایک دُھن ۲۲۵۵ ق م میں تیار ہوئی تھی جس نے ڈیڑھ ہزار سال بعد کنفوشیس کو اِس درجہ مسحور کیا کہ "اُسے مہینوں تک کسی غذا کا ذائقہ تک محسوس نہیں ہُوا۔" نہایت ابتدائی ساز غالباً وہ تھا، جس میں بہت سے پتّھر برابر برابر لٹکا دیے گئے تھے۔ یہ پتّھر آپس میں ٹکرا کر ہم آہنگ آوازیں پیدا کرتے تھے۔ ۲۳۰۰ قبل مسیح کی ایک حمد میں 'چن' نامی ایک ساز کا ذکر ہے۔ جو پیانو کے طرز کا تھا اور جس میں ریشمی دھاگے استعمال کیے گئے تھے۔ انھیں پیچ دار کیلوں کے ذریعے تان دیا گیا تھا۔ اسی قسم کے

دوسرے ساز اور پیانو اسی کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ارگن باجے کی ابتدائی شکل قدیم یونان میں استعمال ہوتی تھی لیکن چین میں بالکل شروع میں "شینگ" نامی ایک ساز استعمال ہوتا تھا، جو بانس کی سولہ چھوٹی بڑی بانسریوں پر مشتمل تھا۔ انھیں ایک صندوقچی جیسی چیز میں لگا دیا جاتا تھا اور ان کا اصول ارگن باجے جیسا ہی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس ابتدائی دور میں روس کا ایک سفیر یہ بانسریاں اپنے ملک لے گیا تھا اور اس نے سینٹ پیٹرس برگ کے ایک موسیقار کو ابتدائی طرز کا ارگن باجا اور ہارمونیم تیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

چین اور ہندوستان میں سارنگی ساتھ ساتھ ایجاد ہوئی۔ پہلے کمان کی تانت کو انگلیوں سے مرتعش کیا جاتا تھا اور پھر اُسے ایک کھوکھلے بکس پر گھسا جانے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا کا قدیم ترین باغ جاپان میں کیوٹو کے قریب واقع ہے۔ اس کا زمانہ ۶۶۵ء کا بتایا جاتا ہے۔ اس وقت چین میں سانگ خاندان کی حکومت تھی۔ جاپان کے لوگ چینی آرٹ سیکھنے چین آتے تھے۔ انھوں نے شہنشاہ یانگ ٹی کا عظیم باغ دیکھا جو "پانچ جھیلیں اور چار سمندر" کہلاتا تھا۔ انھوں نے نہریں، مصنوعی پہاڑ، آبی چٹانیں اور ان کا معقول بندوبست اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ انھوں نے چینی ماہرین سے اپنے لیے باغات تعمیر کرائے تھے جن کے باقیات آج تک موجود ہیں۔

سنگ خاندان کے دورِ حکومت میں چین کے باغات اپنے شباب پر تھے۔ یہ عہد دسویں سے تیرھویں صدی تک جاری رہا۔ خوب صورت پُل، قہوہ خانے، اور آبشاریں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ یہیں سے سیّاح ان تمام چیزوں کا خاکہ اپنے ذہن میں لے کر اپنے وطن واپس جاتے تھے۔ اسی زمانے میں مارکوپولو نے ہانگ چو دیکھا اور اُسے دنیا کا خوب صورت ترین شہر قرار دیا۔

چینی باغات میں چھوٹے پیمانے پر تمام مناظر کا انتظام کیا جاتا تھا۔ مصنوعی پہاڑ، چٹانیں، آبشار اور جھیلیں ترتیب دی جاتی تھیں۔ بعض اوقات اس کام میں ہزاروں مزدوروں سے

مدد لی جاتی تھی۔ وہ چٹانیں کاٹتے تھے اور نہریں اور جھیلیں کھودتے تھے۔ چینیوں کو قدرتی مناظر بے حد عزیز تھے۔ وہ اپنی جاگیروں میں مصنوعی طور پر ان کا انتظام کر لیتے تھے۔

چینیوں کے اس شوق کا مصوری پر بڑا اچھا اثر پڑا۔ چینی مصوروں کا مشہور ترین مکتب "پہاڑ اور پانی" کے نام سے موسوم ہُوا۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مصور تھے قومی جانوروں کی تصویریں بنانے والے، ہان خاندان کے لوگ، بودھ مکتبِ خیال کے مصور جو دیواروں پر تصویریں بناتے تھے۔ یہ تصاویر ابھی تک مشہور چلی آتی ہیں، نازک پُھولوں اور چڑیوں کی تصاویر بنانے والے، خطّاطی میں تصویروں کا حُسن پیدا کرنے والے۔ ان کی تحریر اتنی حسین ہوتی تھی اور اُس میں ایسے پیچ و خم ہوتے تھے کہ تصویر کے معنی پیدا ہو جاتے تھے۔

بایں ہمہ چین کی بہترین تصاویر وہ ہیں جن میں قدرتی مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بعض بعض ہمیں انوکھی معلوم ہوتی ہیں کیونکہ کہیں کہیں پہاڑوں کی یہ چوٹیاں نہایت بلند ہیں۔ نشیب بہت گہرے ہیں اور گھاٹیاں نہایت وسیع۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چینی مصوّر کا مقصد منظرکشی ہوتا ہے، عکاسی نہیں۔ چین کے عظیم ترین مصوّر عرصۂ دراز تک مطلوبہ منظر کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ کوئی خاکہ تیار نہیں کرتے اور جب تصویر بناتے ہیں تو اپنے برش سے اُس منظر کی روح کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تصویر اُن کے دل میں موجود رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چینی تصاویر کا ظاہری تناسب یورپی تصاویر سے مختلف ہوتا ہے۔

چین میں زیادہ تر تصاویر ریشم یا باریک کاغذ پر بنائی جاتی ہیں اور پھر انھیں موٹے کاغذ پر چپکا کر پیسٹ دیا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض کاغذ کئی فیٹ لمبے ہوتے ہیں اور اُوپر سے نیچے یا دائیں بائیں کھلتے ہیں۔ زیادہ تر تصاویر

ہیں فاصلوں کو ہلکے رنگوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ صرف مرکزی خیال کو اُبھارا جاتا ہے۔ موسمِ خزاں کے مناظر کو میپل کے سُرخ پتّوں کے ذریعے ظاہر کیا جاتا ہے۔ موسمِ بہار میں آڑو کے گلابی پھُولوں کی بہار دکھائی جاتی ہے۔ بعض تصاویر میں بانس کی نرم و نازک شاخیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ برف اور بانس عام طور پر ساتھ ساتھ بنائے جاتے ہیں کیونکہ بانس سدا بہار ہوتے ہیں اور ان کا رنگ برف پر بھلا لگتا ہے۔ کیوشی[1] نے مصوّری کے متعلّق لکھا تھا" بانس کی تصویریں بنانے والے مصوّر چاندنی رات میں ریشم کے ایک ٹکڑے پر اس کے ڈنٹھل کا عکس ڈالتے ہیں۔ اُس وقت انھیں اُس کے حُسن کا پتہ چلتا ہے۔" چینی مصوّر اپنے شاہکاروں میں یہی حُسن پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

چین کی بعض بہترین تصاویر صرف چینی روشنائی سے ہی تیار ہوتی ہیں۔ اس کے متعلّق ایک چینی ناقد کہتا ہے" اگر ریشم پر لاپرواہی سے روشنائی چھڑکی جاتی ہے تو وہ مُردہ ہو جاتی ہے اور . . . . . جو روشنائی واضح ہو جاتی ہے، وہ زندہ ہو جاتی ہے۔" یک رنگی کو رنگ دار تصاویر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کیوں کہ یک رنگ تصاویر میں برش کی نوک پر سب کچھ منحصر ہوتا ہے۔ کہیں اُسے نرمی سے دبایا جاتا ہے اور کہیں سختی سے۔

چار موسموں کا موضوع کافی پسندیدہ سمجھا جاتا ہے اور اُسے کئی طرح ظاہر کیا جاتا ہے۔ ہر تصویر میں موسمی پھلوں، پھُولوں، چڑیوں اور کیڑوں مکوڑوں پر زور دیا جاتا ہے۔ چار موسموں کی یہ تصاویر ایک ہی دیوار پر یا تو برابر فاصلوں پر یا دو ایک ساتھ لٹکائی جاتی ہیں۔ تصاویر کے عام طور پر جوڑے ہوتے ہیں اور اُنھیں

---

[1] Kuo Hsi

اسی طرح لٹکایا بھی جاتا ہے۔

پنکھوں کی تصویر کشی ایک جداگانہ آرٹ ہے۔ یہاں جگہ کم ہوتی ہے اور فن کار کو بڑا منظر تھوڑی جگہ میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہاں سادگی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور تفصیل سے گریز کیا جاتا ہے۔ چینی لوگ ایسے مصوّر کی بڑی قدر کرتے ہیں جو ایک پنکھے پر دس ہزار میل کے مناظر پیش کر دے۔

چین میں مصوّری اور تحریر کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کے بغیر دوسری بے کار ہے۔ یہ صورت ۲۲۰ قبل مسیح کے بعد پیدا ہوئی، جب بالوں کا برش ایجاد ہو گیا۔ اس سے پہلے لکھنے کے لیے ہڈیاں اور گھونگھے استعمال کیے جاتے تھے۔ پھر بانس کی تختیوں پر روغنی روشنائی اور نوک دار لکڑی کی مدد سے ظروف بنائے جانے لگے۔

چینی تحریر اب بھی بہت کچھ مصوّری سے مشابہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب بعض تصاویر کی جگہ چند نشانات استعمال کیے جاتے ہیں تاہم بہت سے الفاظ سے ان کی اصلیّت ہویدا ہوتی ہے۔ مثلاً ٹانگوں جیسے دو نشانات کا مطلب آدمی ہوتا ہے۔ ایک دائرہ کھینچ کر اُسے ایک خط سے کاٹ دیا جاتا ہے تو دِن مراد ہوتا ہے یعنی سُورج افق پر چمک رہا ہے۔ گھوڑے کے لیے اُس کا اصلی خاکہ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی صورت بھیڑوں اور مچھلیوں کی ہے۔

اشیاء کے علاوہ عمل کو ظاہر کرنے کے لیے بھی بعض نشانات سے مدد لی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہنا ہو کہ "یہ مشکل سے اُگتا ہے" یا "اسے اُگنے میں دشواری ہوتی ہے" تو بل کھائی ہوئی گھاس بنا دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے دلچسپ الفاظ اور بھی ہیں مثلاً بہار۔ اسے ظاہر کرنے کے لیے اُگتے ہوئے پودوں کے نیچے لفظ سُورج دکھایا جاتا ہے۔ نر کو ظاہر کرنے کے لیے چاول کا کھیت اور

کش مکش استعمال کرتے ہیں۔ وفا کی ترجمانی ایک مرد کرتا ہے جسے اپنے قول کا پاس ہے۔

برش کی ایجاد و ترقی کے بعد مصوّری اور خطّاطی میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ مصوّری میں حُسن کی اور تحریر میں خیالات کی ترجمانی مقصود تھی۔ تحریر کی اہمیت اِس لحاظ سے زیادہ ہے کہ وہ جتنی زیادہ خوب صورت ہو گی اُتنی ہی خیالات کی قیمت زیادہ ہو جائے گی جنھیں وہ ظاہر کر رہا ہے۔ برش کی تحریر کی بہت سی قسمیں پیدا ہو گئیں۔ ان کا فطرت سے وہی تعلّق ہے جو خوب صورتی کا ہے۔ مثلاً دیوار سے چپٹی ہوئی انگور کی خشک بیل کو ظاہر کرنے کے لیے برش کا ایک شوشہ استعمال کیا جاتا ہے، جست لگاتا ہُوا شیر دوسرے شوشے سے ظاہر کیا جاتا ہے، ایک ہرن جو چھلانگ لگانے کو تیار ہے برش کی ایک اور جنبش سے ظاہر کیا جاتا ہے اور گھوڑے کی طاقت ظاہر کرنے کے لیے ایک اور نشان استعمال کیا جاتا ہے۔ مختلف شوشوں کے مختلف ماہر پیدا ہوئے جنھوں نے داناؤں کے اقوال کے طغرے تیار کیے۔ انھیں بڑی احتیاط سے کام کرنا پڑتا تھا کیونکہ جب چینی روشنائی کاغذ یا ریشم پر لگ جاتی ہے تو اس میں اصلاح نہیں کی جا سکتی۔

عظیم مندروں اور مشہور مقامات کی سیر کرنے والے لوگ خطّاطی کے نمونوں کو بھی اُسی ذوق و شوق سے دیکھتے ہیں جس طرح تصویروں کو، کیونکہ ان میں مختلف الفاظ اور خوب صورت شوشے اپنا مطلب خود بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ چین میں داناؤں کی کتنی قدر ہوتی تھی۔

چینی الفاظ حروفِ تہجّی سے بننے والے الفاظ کے مقابلے میں غالباً زیادہ بے ڈھنگے ہیں تاہم اُن کا اپنا ایک نظام ضرور ہے۔ اِس نظام میں ہر شوشے کو ایک حرف کی حیثیت حاصل ہے۔ شروع میں وہ تصویری نشانات تھے۔ اب انھیں مختصر کر دیا گیا ہے۔ وہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض سے مختلف الفاظ کا تلفّظ اور بعض سے اُن کے معنی

ظاہر ہوتے ہیں۔ لغتوں کی اساس الفاظ کا باہمی تعلّق ہے۔ بنیادی نشانات کی تعداد دو سَو چودہ ہے۔ لغت میں کوئی لفظ دیکھنا ہو تو اس کا پتہ صَوتی اعتبار کی بجائے معنوی اعتبار سے لگے گا۔ چینی لغت اُردو، انگریزی لغتوں سے مختلف ہوتی ہے۔ جن میں تمام الفاظ حروفِ تہجّی کے اعتبار سے ترتیب دیے جاتے ہیں۔

گذشتہ چند برسوں میں نئے خیالات کو ظاہر کرنے کے لیے بہت سے نئے الفاظ وجود میں آئے ہیں۔ جس طرح خیال اور آواز کی ہم آہنگی سے پرانے الفاظ بنے ہیں، اُسی طرح یہ نئے الفاظ بھی ایجاد ہوئے ہیں۔ چینی کمیونسٹ اپنے مُلک کو جدید خطوط پر تعمیر کر رہے ہیں، اِس لیے انھوں نے چینی زبان کے حروف کو بھی سادہ کر دیا ہے وہ بھی حروفِ تہجّی تیار کرنا چاہتے ہیں۔ دُنیا منتظر ہے کہ یہ لوگ اپنی اِس نئی زبان میں کیا کہنا اور لکھنا چاہتے ہیں۔ دُنیا کی اقوام امن سے رہنا چاہتی ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنا چاہتی ہیں +

بچّوں کے ناول

ایک مکان دو دیواریں

کمال احمد رضوی

صفحات ۱۴۳

قیمت ۹۴ پیسے

ہونہار امجد نہایت شریر اور شوخ لڑکا ہے۔ لیکن بلا کا ذہین بھی ہے اس کی شوخی اور شرارت کا انجام ایک مکان میں دو دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں اور اُسے بہت دُکھ جھیلنا پڑتے ہیں لیکن اس کی نیکی اور بلند کرداری تمام غلط فہمیوں کو دُور کر دیتی ہے — پھر مکان کی دیواریں گر جاتی ہیں اور نہ صرف سارا گھر بلکہ تمام ملک اسے ایک ہی مکان محسوس ہوتا ہے — ایک نیک بچّہ کی نفسیات اور اس کے اخلاق اور اصلاحی پہلو بڑی خوبی سے اُجاگر کیے گئے ہیں۔

•

عقاب

لطیف فاروقی

صفحات ۱۱۲

قیمت ۷۵ پیسے

یہ تاریخ اسلام کی ایک داستان ہے، جس کا تعلّق موسیٰ بن نصیر سے اور بربر قبیلہ کے ایک فرد یعقوب سے ہے۔ موسیٰ بن نصیر کے سکول میں یعقوب جب اپنے بچوں کو بھیجنے کا قطعی فیصلہ کرتا ہے تو اس کے سردار حبیب سے تلوار چل جانے پر نوبت پہنچتی ہے۔ لیکن علم کے شیدا یعقوب اور ان کے بچے حالات پر اس طرح قابو پاتے ہیں کہ سارا قبیلہ پھر انھیں وقعت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے اور یہ علم کی بدولت موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے کئی مفتوحہ علاقوں کے حاکم بن جاتے ہیں۔

•

یہ غازی

سید نظر زیدی

صفحات ۱۱۲

قیمت ۷۵ پیسے

اس تلوار کے حیرت انگیز کارنامے، جو آج سے سالہا سال پہلے غازیِ اسلام صلاح الدین ایّوبی کے ہاتھوں انجام پائے، اس ناول میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے عزم و ہمّت، جوش و ولولہ، اخلاق و کردار کی بلندی اور اسلام کی سچّی محبّت دل میں پیدا ہوتی ہے۔

پہلا مجاہد

سیّد نظر زیدی
صفحات ۱۸۶
قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے

یہ فاتح سندھ محمد بن قاسم کی مشہور و معروف داستان ہے، جس میں اس کم سن سپہ سالار کی عزم و ہمّت اور جوش و ولولہ کی تصویر ناول کی شکل میں اتاری گئی ہے۔ نہایت سلیس اور صاف زبان میں۔ بے حد دلچسپ اور نہایت مفید۔

مسلمان

عشرت رحمانی
صفحات ۱۴۸
قیمت ۹۷ پیسے

شہریار ملکِ یمن کے ایک مردِ مجاہد کی داستان، جس کے اہل خاندان نے فارس کے کافروں کا سرفروشی سے مقابلہ کیا۔ شہریار کون تھا؟ کس نام سے مشہور ہُوا؟ اس نے اسلام کے پیغام کو عام کرنے کی خاطر کیا کیا اور اس کا انجام کیا ہُوا؟ یہ سب آپ کو اس داستان میں مل جائے گا۔ ملّتِ اسلامیہ کے روشن اور درخشندہ کارناموں سے ایمانی روح تازہ ہوجائے گی۔

ایک ننھا لڑکا

الطاف فاطمہ
ایم اے
صفحات ۱۰۲
قیمت
ایک روپیہ ۱۹ پیسے

بادشاہوں کے قصّے زمانے کے ساتھ ساتھ پرانے ہوتے چلے گئے اب ہمیں ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے، جس میں عزم و ہمّت اور سمجھ بوجھ کی اتنی کامیاب تلقین ہو کہ ہم اپنے ملک اور خاندان کو خوش حال بنا سکتے ہوں۔ اس ناول میں اسی مقصد کے پیش نظر ایک ایسے تعلیم یافتہ خاندان کے ذہین نونہالوں کی کہانی پیش کی گئی ہے جو بچپن ہی سے کھیل کود کی دلچسپی میں مصروف رہتے ہوئے ملک و خاندان کی فلاح و بہبود کے متعلق سوچتے رہتے ہیں اور بڑے ہو کر اپنا نام روشن کرتے ہیں۔ اس خاندان کا "ایک ننھا لڑکا" اس کا ہیرو ہے۔ یہ ناول بے حد مزے دار اور سبق آموز کہانی کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔

شاہ آباد

عشرت رحمانی
صفحات ۹۶
قیمت ۶۵ پیسے

یہ کہانی ایک مشہور اور دلچسپ انگریزی قصہ "سنہرے دریا کا بادشاہ" سے اخذ کر کے عام فہم سلیس اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس عجیب و غریب داستان میں نیکی، بدی، جرأت اور ہمّت کے حیرت انگیز کارنامے اور غرور و گھمنڈ، ظلم و ستم کا عبرت ناک انجام دکھایا گیا ہے۔

گولر کا پھول

شوکت تھانوی
صفحات ۱۵۲
قیمت
ایک روپیہ

کہتے ہیں کہ اگر گولر کا پھول کسی کے ہاتھ آ جائے تو گویا دنیا کی بادشاہت ہاتھ آ گئی۔ اس کہانی کے ہیرو سہیل کے گولر کا پھول ہاتھ لگ گیا اور اس کی بدولت وہ ایک عجیب و غریب دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں کے رہنے بسنے کا طریقہ، ملنے ملانے کا قاعدہ، وہاں کے ادب و تہذیب، غرض ہر شے ہماری اس دنیا سے بالکل عجیب سی نظر آئی۔ آپ اسے پڑھیں گے تو ہنستے ہنستے آپ کے پیٹ میں درد ہونے لگے گا۔

●

میرے ہمسائے

بشارت انور
صفحات ۸۸
قیمت
۶۲ پیسے

یہ ہیں تو دس کہانیاں، جو انگریزی زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک خاص بات اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ان میں ایک ایسا تسلسل پایا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر اسے ناول بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ ایک کتاب دس مختلف کہانیوں کا مجموعہ یا ایک ناول ہے۔ یہ کہانیاں بے حد دلچسپ، سبق آموز اور پُرتاثیر ہیں۔

بچوں کے لیے

دلچسپ اور مفید سائنسی معلومات کی کتابوں کا سلسلہ

(یہ سب کتابیں خوبصورت تصاویر سے مزین ہیں)

کتاب		مترجم	قیمت
آنکھوں سے کام لیجیے	ترجمہ	محمد سعید	۱/۵۰
آواز کی کہانی	ترجمہ	مسعود احمد خاں	۱/۲۵
بچوں کے لیے سائنسی تحقیق کی نئی راہیں	ترجمہ	محمد فاروق	۲/۵۰
تمھارا جسم کیونکر کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۴/۵۰
ریڈیو اور ٹیلی ویژن	ترجمہ	سید ذوالفقار علی بخاری	۴/۵۰
حیوانی زندگی کا ماضی و حال	ترجمہ	ڈاکٹر نذیر احمد	۵/-
دنیا پر پہلی نظر	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۱/۵۰
زمین کی سرگذشت	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۴/-
سائنس باتوں باتوں میں	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۴/-
سائنس کے نئے اُفق	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۵/-
ستاروں کی دنیا	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۵/-
سائنس کی حیرت انگیز باتیں	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
عجائباتِ کیمیا	ترجمہ	محمد فاروق	۴/۵۰
سمندروں کی دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر نذیر احمد	۴/۵۰
کیمیا کے رومان	ترجمہ	پروفیسر حمید عسکری	۵/-
موسم کی کہانی	ترجمہ	بشیر احمد ساجد	۴/۵۰

مشہور مہمات سائنس	ترجمہ	محمد فاروق	۴/۵۰
میرے اندر کیا ہے	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۱/۵۰

بنیادی سائنس کا سلسلہ

(بہترین آفسٹ طباعت رنگا رنگ تصاویر)

(مطبوعہ ایران)

انسانی مشین	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۱/۵۰
آواز	″	″	۱/۵۰
پرندے	″	″	۱/۵۰
پھول پھل اور بیج	″	″	۱/۵۰
چاند	″	″	۱/۵۰
حرارت	″	″	۱/۵۰
روشنی	″	″	۱/۵۰
زندہ اشیاء	″	″	۱/۵۰
ستاروں سے آگے	″	″	۱/۵۰
کشش ثقل	″	″	۱/۵۰
کیڑوں کی سماجی زندگی	″	″	۱/۵۰
مٹی	″	″	۱/۵۰
مشینیں	″	″	۱/۵۰
مقناطیس	″	″	۱/۵۰
موسم	″	″	۱/۵۰

مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، ۶۶۔ مزنگ روڈ، لاہور

فنی معلومات

(ذیل کی کتابیں بھی رنگین تصویروں سے مزین ہیں)

بجلی کی پہلی کتاب	ترجمہ	سید علی ناصر زیدی	۲/۵۰
ٹیلی فون کیسے کام کرتا ہے	ترجمہ	خلیق ابراہیم خلیق	۱/۲۵
خلاء میں سفر کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
طیاروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰
موٹروں کی پہلی کتاب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۲/۵۰

تاریخ

تاریخ بھی مزے کی چیز ہے (تصویر دار)	ترجمہ	مولانا عبدالمجید سالک	۱/۵۰
سو تاریخی واقعات (تصویر دار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا غلام رسول مہر	۷/۰

سوانح

سو بڑے آدمی (تصویر دار)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۵/۰
غریب لڑکے جو نامور ہوتے (مصور سرورق)	ترجمہ و ترتیب	مولانا عبدالمجید سالک	۴/۰
لڑکیاں جو نامور ہوئیں	ترجمہ / ترتیب	اختر عزیز احمد / مولانا عبدالمجید سالک	۵/۰
مشہور موجد اور اُن کی ایجادیں	ترجمہ	ابوالحسن نغمی	۲/۷۵

ہماری دیگر مطبوعات

(والدین اور اساتذہ کی رہنما مصوّر کتابیں)

(یہ سب کتابیں تصویر دار ہیں)

آپ کے بچے کی وراثت	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۰
بچوں کی بدتمیزیاں	"	"	۱/۰
بچوں کے کھیل	"	"	۱/۵۰
بچے کی اخلاقی قدریں	"	"	۱/۵۰
کامیاب باپ	"	"	۱/۵۰
معاشرتی زندگی میں بچوں کی رہنمائی	"	"	۱/۵۰

صحت اور طب

بچہ اور اس کی دیکھ بھال	تصویر دار	ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۶/۵۰
آپ کے بچے کی صحت	تصویر دار	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۶۲
بیماری کے جذباتی اور نفسیاتی پہلو		ترجمہ	سیّد وقار عظیم	۱/۶۲
اتفاقات جو عظیم طبّی کارنامے بن گئے		ترجمہ	ڈاکٹر محمد عبدالقوی لقمان	۵/۰

اقوامِ متحدہ	ترجمہ	فضل حق قریشی	۴/۰
امریکہ کا سیاسی نظام	ترجمہ	مولانا صلاح الدین احمد	۳/۵۰

مذہب و اسلامیات

خدا ہمارے ساتھ ہے	ترجمہ	مولانا اصلاح الدین احمد	۱/۲۵
خدا موجود ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالحمید صدیقی	۲/۵۰
اسلام اور قانون جنگ و صلح	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۹/-

تعلیم و تعلم

آزاد تعلیم اور جمہوری نصب العین	ترجمہ	سید وقار عظیم	۳/-
بچے کی تعلیم میں گھر اور مدرسے کا تعاون	ترجمہ	فضل محمد خاں	۸/-
تعلیم کے مقاصد	ترجمہ	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ	۵/۵۰
مدرسے کی زندگی میں بچے کی رہنمائی	ترجمہ	سید وقار عظیم	۱/۶۲
والدین اور معلمین	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۱/۵۰

انسانیات

مستقبل کا انسان	ترجمہ	سید قاسم محمود	۶/-
ثقافت کا مسئلہ	"	"	۱/-
قدیم تہذیب اور جدید انسان	"	"	۳/۵۰
قدیم علوم اور جدید تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/-

تاریخ

انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	
جلد اول، تاریخ اسلام	"	"	۱۲/-
جلد دوم، تاریخ عالم	"	"	۱۲/-
جلد سوم	"	"	۱۴/-

تاتاریوں کی یلغار	ترجمہ	عزیز احمد	۱۲/۰
صلیبی جنگیں	ترجمہ	سید رئیس احمد جعفری	۵/۰
عرب دنیا	ترجمہ	ڈاکٹر محمود حسین	۱۲/۰
کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/۰

سوانح

ایڈیسن	ترجمہ	محمد سعید	۳/۵۰
چند عظیم علمائے جراثیم	ترجمہ	عبدالمجید قریشی	۱۰/۰
سقراط	ترجمہ	آنسہ صبیحہ حسن	۲/۵۰
غازیانِ تہذیب	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۵/-
سلطان صلاح الدین ایوبی	ترجمہ	پروفیسر محمد یوسف عباسی	۱۷/۵۰
نور محل	ترجمہ	شبلی ایم کام و حبیب اشعر دہلوی	۷/۵۰

معاشیات

آبادی کا مسئلہ	ترجمہ	شبلی ایم کام	۱/۵۰
خوراک کا مسئلہ	ترجمہ	″ ″ ″	۱/۵۰
عظماء کے معاشی نظریات	ترجمہ	ڈاکٹر ایس ایم اختر	۶/-

فلسفہ

داستانِ فلسفہ	ترجمہ	سید عابد علی عابد	۱۶/-
ناقابلِ تسخیر ذہنِ انسانی	ترجمہ	محمد صفدر میر	۲/۵۰
فلسفے کی نئی تشکیل	ترجمہ	انتظار حسین	۲/-

مطبوعات فرینکلن پوسٹ بکس ۳۶۹، ۶۶-مزنگ روڈ، لاہور

فنونِ لطیفہ

شاہکار تصاویر	ترجمہ و ترتیب	سید امتیاز علی تاج	۷/۵۰

جغرافیہ اور سیاحت

عرب اور اہلِ عرب	ترجمہ	مولانا غلام رسول مہر	۶/۰
نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز	ترجمہ	گروپ کیپٹن فیاض محمود	۳/۵۰
یہ ہے شمالی افریقہ	ترجمہ	سیّد عابد علی عابد	۲/۵۰

ناول، افسانے، ڈرامے

انجان راہی	ترجمہ	شان الحق حقّی	۳/۵۰
بادبان	ترجمہ	سیّد قاسم محمود	۶/۰
بشر ہے کیا کہیے	ترجمہ	سیّد عابد علی عابد	۹/۵۰
پہلا خون	ترجمہ	غلام حسین	۲/۵۰
چنگیز خاں کے سنہرے شاہین	ترجمہ	اشفاق احمد	۶/۰
دھوپ چھاؤں	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۷/۰
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے	ترجمہ	سیّد رئیس احمد جعفری	۳/۵۰
شہرپناہ	ترجمہ	ابنِ انشا	۳/۵۰
گھاس کا سمندر	ترجمہ	سیّد قاسم محمود	۱/۵۰
قیامت کی رات	ترجمہ	سیّد عابد علی عابد	۷/۰
مفرور	ترجمہ	سیّد رئیس احمد جعفری	۴/۰
ننھی بی بیاں	ترجمہ	حجاب امتیاز علی	۵/۵۰

نئے پرانے	ترجمہ	محمد یوسف عباسی	۴/۰
ہمیں چراغ ہمیں پروانے	ترجمہ	قرۃ العین حیدر	۱۰/۰
ویران ہے دل	ترجمہ	قیسی رامپوری	۶/۰
اندھا کنواں	ترجمہ	ابن انشا	۷/۵۰
انوکھی کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۵/۰
بڑا ریچھ	ترجمہ	ولی اشرف صبوحی	۳/۵۰
پاپ کی نگری	ترجمہ	سیدہ نسیم ہمدانی	۶/۰
حیرت ناک کہانیاں	ترجمہ	شاہد احمد دہلوی	۴/۰
قصص الحمرا	ترجمہ	سید ذوالفقار عظیم	۷/۵۰
خزانے کی تلاش	ترجمہ	شبلی ایم کام	۲/۵۰
سورج کے ساتھ ساتھ	ترجمہ	عشرت رحمانی	۶/۵۰
لاکھوں کا شہر	ترجمہ	ابنِ انشا	۳/۵۰
ایک حمام میں	ترجمہ	عشرت رحمانی	۳/۰
پھول کی پتی، ہیرے کا جگر	ترجمہ	ہلال احمد زبیری	۶/۰

نئی کتابیں

آدمی کی انسانیت	ترجمہ	مولانا محمد بخش مسلم	۷/۵۰
فلسفے کا نیا آہنگ	ترجمہ	بشیر احمد ڈار	۳/۵۰
کائنات اور ڈاکٹر آئن شٹائن	ترجمہ	میجر آفتاب حسن	۱/۷۵
مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا	ترجمہ	سید ہاشمی فرید آبادی	۱/۷۵
کیا سائنس ہمیں بچا سکتی ہے	ترجمہ	پروفیسر عبدالواحد	۱/۷۵

موسسہ مطبوعات فرینکلن، پوسٹ بکس ۳۶۹، لاہور

، لاہور

مرقعِ اقوامِ عالم

اس سلسلے کی کتابوں کا مقصد یہ ہے کہ بچوں کو دُنیا کی برادری کی مختلف قوموں کی طرزِ زندگی ان کی تاریخ اور ان کے ملکوں کے متعلق مستند اور دلچسپ معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ ہر کتاب میں معلومات کے علاوہ خوبصورت اور دلچسپ تصاویر بھی شامل ہیں۔ ان کتابوں کے مصنفوں نے یہ کتابیں متعلقہ ملکوں کی سیاحت کر کے بڑی تحقیق کے بعد لکھی ہیں۔ اس لیے ان میں مندرج معلومات بہت مستند ہیں۔

سرزمین اور باشندے	تصنیف	ترجمہ
آسٹریلیا	بلنڈن	عبدالحمید قریشی
بلجیم	لوڈر	غلام رسول مہر
چین	سپنسر	علی ناصر زیدی
مصر	زکی نجیب محمود	ہاشمی فرید آبادی
انگلستان	سٹریٹ	علی ناصر زیدی
فرانس	بریگڈن	عبدالحمید قریشی
جرمنی	ورنر کرش	عبدالحمید قریشی
یونان	گیاناگوس	عبدالحمید قریشی
ہالینڈ	بارنو	صادق علی دلاوری
انڈونیشیا	ڈیٹس سی سمتھ	ابوالحسن نغمی
اٹلی	ونوار	غلام رسول مہر
جاپان	داگان	غلام رسول مہر
سپین	لوڈر	ہاشمی فرید آبادی